ہندستان کے مشہور اطباء

حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمٰن

ہندوستان کے مشہور اطبّاء

حکیم حافظ سیّد حبیب الرّحمٰن

ترقّی اُردو بیورو نئی دہلی

HINDUSTAN KE MASHHOOR ATIBBA
By
HAKIM SYED HABIBURREHMAN

سنہ اشاعت اکتوبر، دسمبر — 1988 شک 1910

پہلا اڈیشن : 2000

قیمت : /18

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 598

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی -110066

طابع : جے کے آفسیٹ پرنٹرز جامع مسجد دہلی۔

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، بچّوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مُسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور اردو دنیا کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال رکھتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو

فہرستِ اطبّاء

عرضِ مصنّف

پتھروں کے ابتدائی زمانے میں عبادت گاہوں کے راہب جھاڑ پھونک کے پردے میں جڑی بوٹیاں بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ طب کی یہ ابتدائی صورت تھی۔
اس فن کو سب سے پہلے باقاعدہ اسقل بیوس نے اختیار کیا۔ اسقل بیوس حضرت ادریس علیہ السّلام کے دور میں گزرا ہے۔ اسقل بیوس کے بعد بے شمار دردمند انسانوں نے طب کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ یونانی طبیبوں کی تعداد کی ایک طویل فہرست ہے جو ایک طویل عرصے میں پھلے پھولے اور بڑھے۔ وہ جواہر ریزے جو آسمانِ طب پر ماہ و انجم کی طرح چمکے۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔
فیثا غورث۔ افلاطون۔ بقراط۔ ارسطو۔ لقمان۔ جالینوس۔
ظہورِ اسلام کے بعد طبِ نبوی سے اس فن شریف کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ عرب کا مشہور طبیب حارث بن کلدہ تھا۔ رفتہ رفتہ طب کی کتب سریانی۔ عبرانی اور یونانی سے عربی زبان میں منتقل ہونی شروع ہوگئیں۔ اس فن کو حشو و زوائد سے پاک و صاف کیا گیا۔ بے شمار اضافے ہوئے۔ طب یونانی کی درس گاہیں اور بیمارستان (اسپتال) کھلنے شروع ہوگئے۔ اس طرح طب یونان کا ارتقا ہوگیا۔ یہ سہرا ان اطبا، حضرات کے سر جاتا ہے۔ بخت یشوع۔ جبرئیل بن بخت یشوع۔ حنین بن اسحاق۔ یوحنا بن ماسویہ۔ علی بن ابن طبری۔ جابر بن حیان۔ محمد بن ذکریا رازی۔ ثابت بن قرۃ۔ ابو سہل مسیحی۔ ابو القاسم زہراوی ابن الہیثم۔ شیخ بو علی سینا۔ جرجانی۔ داؤد انطاکی۔
ہندوستان میں ویدک طریقۂ علاج رائج تھا۔ مغلوں کی آمد کے ساتھ طبِ یونانی کا رواج بھی رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ گیلانی۔ حکیم علوی خان۔ حکیم محمد اکبر

ارزانی۔ حکیم اعظم خاں نے نہ صرف طب یونانی کو عروج پر پہنچایا۔ اپنے تجربات سے گراں قدر اضافے کئے بلکہ اپنے پیچھے بے شمار تصنیف و تالیف کا ذخیرہ بھی چھوڑا۔ فن طب یونانی کے لئے ان اطباء کی خدمات جلیل القدر اور ناقابل فراموش ہونے کی بین ثبوت ہیں۔

عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات اور ماضی کے حالات کے مطالعہ کا سب سے بڑا فائدہ انسان کو یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت اور طبیعت سے آگاہی حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دور کی ہستیوں کو بلکہ خود اپنی ہستی کو بھی پرکھتا ہے اور اپنی قدر و قیمت کا تعین بھی کرنے لگ جاتا ہے۔

کیا قدرت نے عظیم شخصیتوں اور ہستیوں کے لئے کوئی الگ معیار اور ان کی تخلیق کے لئے کوئی الگ سانچہ بنا رکھا ہے؟ یا وہ پیدائشی طور پر عظیم ہوتی ہیں۔ یا کچھ ایسی خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں جن کو انسان اپنا کر یا اختیار کر کے بڑا آدمی یا عظیم مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے۔؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو اکثر ذہنوں میں ابھرتے رہتے ہیں۔ پھر سوال آتا ہے کہ آخر عظمت خود کیا شے ہے؟

عظمت وہ دولت غیر مترقبہ نعمت ہے جو نہ تو دولت۔ سرمایہ اور اقتدار کے پیمانے سے ناپی جا سکتی ہے اور نہ ہی جاہ و حشم کا نام عظمت ہے۔ عظمت تعداد یا کمیت کا نام نہیں بلکہ صرف کیفیت کا نام ہے۔ جو کسی انسان کے مزاج میں رچ بس جاتی ہے اور مختلف مواقع پر اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح تھرمامیٹر حرارت کے درجوں کا تعین کرتا ہے اسی طرح انسان کی روش کردار۔ گفتار سے اس کی شخصیت اور اس میں موجود عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ اور خاص کر اپنے اسلاف کے کارناموں کا مطالعہ کرنے سے ذہن و جسم انسانی نہ صرف اس سے اتنا متاثر ہوتا ہے بلکہ اس ماحول۔ حالات کے مطابق خود کو بنانے میں۔ ڈھالنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی گراں قدر۔ گراں مایہ ہستیاں اپنے اندر جس وصف کو جذب کرتی رہیں اور مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتی رہیں

ہیں۔ وہ صرف تاریخ کے مطالعہ اور اس کے اثرات کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ بڑے آدمیوں کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ شجاعت۔ عدل۔ انصاف۔ سخاوت۔ شرافت۔ حسن اخلاق اور جذبۂ فیض رسانی۔ ان ہی اوصاف سے کسی بھی بشر انسانی کی عظمت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عظمت انفرادی ہو یا اجتماعی۔ میدان زندگی میں صرف وہی افراد اور قومیں عظمت حاصل کر سکتی ہیں جو اوصاف حسنہ کو اپنے اندر جذب کرنے کا مادہ رکھتی ہیں۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ان ہی اشخاص کو بقائے دوام حاصل ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاق اور پاک اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔ جو صرف اپنے لئے نہیں جیتے بلکہ دوسروں کے لئے مرتے اور جیتے ہیں۔ اور خلق خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔

سرزمین ہند میں طب کی ایسی بے شمار صاحب کمال ہستیاں گزری ہیں جن سے صاحب نظر و شعور عقیدت کا ملہ رکھتے ہیں اور ان کے کاموں کو نہ صرف درسیات میں بلکہ سبق آموز انداز میں بھی بیان کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت میں اپنے اسلاف کے کارناموں سے کما حقۂ واقفیت اور ان سے عقیدت و محبت کا اظہار ہی کسی قوم کے زندہ و تابندہ ہونے کا ثبوت ہوا کرتا ہے۔

"ہندوستان کے مشہور حکماء" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اور موجودہ قوم بخوبی طور پر ان کے کمالات سے آگاہ ہو سکے۔ اور یہاں کے سماج میں اپنا امتیاز اور اعلیٰ معیار اور طرز زندگی قائم رکھ سکے۔

دنیا میں علوم و فنون کی یہ تاریخ ہے کہ جب جب یہ فن یا علم نسل در نسل ترقی کرتا ہے یا چلتا ہے تو وہ فن یا علم خاندانی اثرات سے ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے اور اس خاندان کو اس فن یا پیشہ کی بنا پر اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہیت ہو یا کسی حیثیت کا ذاتی اقتدار۔ علم و ہنر ہو یا کسی طرح کا فن یہ کبھی ایک ہی فرد پر ختم ہو جاتا ہے اور کبھی پشت در پشت اور پیڑھی در پیڑھی چلتا ہے۔ فن طب میں بھی دنیا میں ایسے ہی واقعات پیش آئے ہیں کہ کبھی ایک فرد تک یہ فن محدود رہا۔ جیسے جالینوس۔ حکیم ذکریا رازی۔

حکیم بو علی سینا وغیرہ وغیرہ اور کبھی نسلوں تک یہ فن چلتا رہا۔ جیسے خاندان زرہ خاندان اسقلبیوس خاندان بخت یشوع اور خاندان حنین وغیرہ۔

اسی طرح ہندوستان میں جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی میں مختلف خاندان اور افراد نمایاں رہے ہیں وہیں فنِ طبابت میں خاندانِ شریفی۔ خاندانِ بقائی۔ اور خاندانِ عزیزی نمایاں حیثیت کے حامل رہے ہیں۔

خاندانِ شریفی

ہندوستان کی تاریخ طب جب مکمل طور پر ترتیب دی جائے گی تو خاندانِ شریفی کے نمایاں تذکرے کے بغیر یہ تاریخ طب ادھوری اور غیر مکمل ہوگی ۔ خاندانِ شریفی ہندوستان کا وہ مایہ ناز خاندان ہے جس نے ہندوستان میں فن طب کو جلا بخشی۔

خاندانِ شریفی کے آبا، واجداد ترکستان کے مشہور شہر کاشغر کے رہنے والے تھے۔ جب شہنشاہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو اس خاندان نے بھی بابر کی رفاقت کی اور شہنشاہ کے ساتھ تمام حملوں میں شریک رہا۔ اس خاندان کے بزرگ جو ہزار سواروں پر مشتمل فوج پر سردار تھے اور خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے نسب سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اور خواجہ عبیداللہ احرار کا خاندان کا شمار ائمۂ دین میں کیا جاتا تھا۔

شہنشاہِ بابر کی کامیابیوں کے بعد یہ خاندان یہیں مقیم ہوگیا اور سلطنت کے امورِ مہمہ یا امورِ سلطنت میں حصّہ لیتا رہا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس خاندان کے جانشینوں کی توجہ سیاست سے زیادہ مذہب کی جانب مبذول ہوگئی چنانچہ اس خاندان کے دو مشہور بزرگ خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم درویش گزرے ہیں۔

خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم حیدرآباد میں مقیم ہوگئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے زہد و تقویٰ کا سندھ میں عام چرچا تھا اور صرف مسلمان

ہی ان دونوں بھائیوں کے حلقۂ مریدین میں شامل نہ تھے بلکہ اہلِ ہنود بھی ان کے جاہ وجلال وبزرگی کے بہت زیادہ معترف اور عقیدت مند تھے۔

ان کی نیکی۔ بے غرضی اور خاموش دعوت سینکڑوں کی اصلاح کا باعث ہوئی۔ خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم کے بعد ملّا علی قاری نے اس خاندان میں خاصی شہرت حاصل کی۔ ملّا علی قاری کی علمی۔ مذہبی ادبی وتاریخی قابلیت۔ ان کی تصنیفات وتالیفات سے ظاہر ہیں۔ جو آج بھی ارباب علم ودانش ومذہب کو فیضان پہنچا رہی ہیں۔

حکیم اجمل خان یا خاندانِ شریفی کے شجرۂ نسب پر سب سے بڑی سند خود حکیم محمود خان اعظم کی ایک تحریر ہے جو خود ان کی اپنی ہی لکھی ہوئی ہے۔ لکھا ہے کہ:-

"مکشوف خاطر باد کتابیکہ درآں سلسلہ خاندانی درج بود ہنگام تقسیم کتب خانہ جدی (حکیم محمد شریف خان) کہ بہ شش پسران منقسم شدہ بود درحصۂ عمومی صاحب کلاں حکیم محمد اشرف خان مرحوم رفتہ وازآں جا بمعرض تلف درآمد لہٰذا از ضبطِ تحریر حال ابتدائی خاندانی معذور ماندم۔"

بابر کی بڑی کامیابی یہ نہ تھی جو اسے میدانِ پانی پت میں ملی تھی بلکہ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس کے حملے کے وقت جو ساتھی اور رفقاء ہندوستان آئے اور اپنی تہذیب اور اپنے علوم وتمدّن کا سرمایہ بھی اپنے ساتھ لائے۔ ان ہی کے سرمایہ سے ہندوستان کی ایک جدید اور مشترک تہذیب کا نقشہ مکمل ہوا۔

اگرچہ اس خاندان نے سیاست اور مذہب میں خاص مقام حاصل کرلیا تھا لیکن ان کی اصل کارکردگی کا میدانِ عمل ابھی تک ان کے کارہائے نمایاں سے خالی تھا۔

اپنے خاندان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں خود حکیم اجمل خاں کے بقول ملّا علی ہی اس دور میں خاندانِ شریفی کے مورثِ اعلیٰ تھے اور وہ اکبر اعظم کے عہد میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تھے۔ اکبر اعظم ہی کے دور میں اس خاندان کا

تعلق دربارِ شاہی سے قائم ہوا چنانچہ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانے تک ہر دور میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد دربارِ شاہی سے وابستہ رہا۔ ملّا علی قاری کے علم و فضل نے ان کے خاندان میں طب یونانی کے فضل و کمال کی راہ اختیار کی۔ ملّا علی قاری اور ملّا علی داؤد کے والد سلطان محمد ہرات کے رہنے والے تھے۔

انہی ملّا علی قاری کے پوتے حکیم فاضل خان نے سب سے پہلے میدانِ طبابت میں قدم رکھا اور تھوڑے ہی عرصے میں وقار حاصل کر لیا۔ جن کے بعد اس خاندان میں ان کے لڑکے حکیم واصل خان اوّل ان کے لڑکے حکیم اجمل خان اوّل۔ حکیم اجمل خان اوّل کے بھائی حکیم اکمل خان اس سلسلے کی درمیانی کڑیاں ہیں۔ حکیم اکمل خان کے صاحبزادے حکیم شریف خان۔ حکیم صادق علی خان۔ حکیم محمود خان۔ حکیم عبدالمجید خان اور حکیم واصل خان جیسے نامور اور قابل طبیب پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خاندانی روایات کو زندہ رکھا اور یہ سب اپنے علم و فضل میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔

سب سے اہم بات ان بزرگوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی رہی کہ وہ ہمیشہ اپنے خاندانی روایات و دستور کو برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے آباؤ اجداد کے وطن ترکستان سے تعلق برقرار رکھنے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں یہ خاندان آگرہ آکر مقیم ہو ہی گیا تھا۔ فاضل خان کے بڑے بیٹے حکیم محمد واصل خان اوّل عہد عالمگیری میں اکبر آباد (آگرہ سے) دہلی آئے اور اورنگ زیب کے آخری زمانے میں دربار کے عہدۂ طبابت پر فائز ہوئے جہاں شہنشاہِ عالمگیر نے خطاب اور منصبِ ہزاری کے علاوہ جاگیرات بھی عطا فرمائی تھیں۔

یہ تھا خاندانِ شریفی کا جاہ و جلال اور سلسلۂ نسب۔

شجرہ خاندانِ شریفی
حکیم شریف خان (۱)
حکیم اشرف خان
حکیم شرف الدین خان
حکیم حسین بخش خان
حکیم حسن بخش خان
حکیم امام الدین خان
حکیم صادق علی خان (۲)
حکیم غلام محمد خان
حکیم غلام محمود خان (۳)
حکیم غلام مرتضیٰ خان
حکیم عبدالمجید خان
حکیم واصل خان
حکیم حافظ اجمل خان (۴)
مسیح الملک ثانی حکیم محمد احمد خان
حکیم حاذق الملک ظفر علی خان
مسیح الملک حکیم جمیل خان (۵)
حکیم محمد نبی خان جمال سویدا لاہور پاکستان۔ (۶)
حکیم احمد نبی خان فیض آباد پاکستان

شجرہ خاندانِ شریفی ۲
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
خواجہ محمد النامی ۱
مولانا عماد الدین
مولانا محمد پاشاغری
مولانا تاج الدین رومی شاشی
مولانا شہاب الدین رومی شاشی
مولانا شاد محمد شاشی
حضرت خواجہ محمد عبداللہ المعروف بہ خواجہ کلاں آنحضرت
حضرت قطب مولانا عبداللہ ناصر الدین احراری
خواجہ محمد یحیی
عبدالعلیم۔
عبدالشہید
ابوالفیض
محمد یوسف
خواجہ سلطان محمد
خواجہ محمد فیروز
ملا علی قادری۔
خواجہ محمد افضل۔
خواجہ محمد قاسم۔
خواجہ محمد ہاشم۔
خواجہ محمد ہندی
خواجہ محمد خورشید
ملا علی داؤد
حکیم فاضل خان

حکیم واصل خان
حکیم اجمل خان اوّل گوالیار
حکیم اکمل خان
حکیم محمد شریف خان
حکیم سعید خان
حکیم اشرف خان۔ حکیم حسن بخش خان۔ حکیم حسین بخش خان۔ حکیم صادق علی خان۔
حکیم امام الدین خاں۔ حکیم شریف الدین خاں
حکیم غلام محمد خان
حکیم غلام محمود خان
حکیم غلام مرتضیٰ خان
حکیم عبدالمجید خان
حکیم واصل خان
حکیم حافظ اجمل خان
حکیم محمد جمیل خان
حکیم محمد نبی خان جمال سویدا پاکستان
حکیم احمد نبی خان بھارت

اشرف الحکماء وامامِ فن حکیم محمد شریف خان

۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۱۴ء ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۹۸ء

خاندانِ شریفی کے اصل بانی حکیم فاضل خان تھے لیکن یہ خاندان اپنے اصل کمالاتِ جوہر کی بنا پر حکیم شریف خان کے نام سے موسوم ہوا۔ جس طرح اودھ کے طبی خانوادے کے بانی حکیم یعقوب تھے لیکن خاندان حکیم محمد عبدالعزیز کے نام سے خاندانِ عزیزی موسوم ہوا۔
جس کی بنیادی وجہ ان اطباء کے کارہائے نمایاں تھے۔
حکیم محمد شریف خان اگرچہ حکیم فاضل خان کے بعد چوتھی پشت میں تشریف لائے لیکن گراں قدر طبی خدمات کی وجہ سے انہی کے نام سے ان کے خاندان نے ہندوستان گیر نہیں بلکہ عالمگیر شہرت حاصل کی۔ دہلی کا یہی وہ قابلِ فخر خاندان ہے جس نے مسلسل بہت سے نامی گرامی اور مایہ ناز اطباء پیدا کئے اور آج نو (۹) پشت کے بعد بھی طبابت کا سلسلہ جاری ہے۔

خاندان :-

تاریخی حیثیت سے حکیم محمد شریف خان کے آباء و اجداد شہنشاہ بابر کے ساتھ بسلسلۂ فتوحاتِ ہند۔ ابتدا میں بحیثیت پیر و مرشد کے وابستہ رہے تھے بعد میں جب نفری تعداد زیادہ ہو گئی تو کچھ نے فوج میں تعلیم حاصل کر کے شمولیت اختیار کرلی۔ چند فنِ طبابت سے وابستہ ہو گئے اور کچھ اپنے سابقہ طریقے پر

حکیم شریف خاں بانیِ خاندان شریفی

جمے رہے۔

اس خاندان میں سب سے پہلے ملا علی داؤد کے فرزند جناب حکیم محمد فاضل خاں صاحب نے فن طب میں مہارت اور شہرت حاصل کی۔ انھوں نے سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ زندگی بھر اپنا آزادانہ مطب کھ کے خلق اللہ کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ ان کے اکلوتے بیٹے حکیم محمد واصل خان اوّل نے ان کے بعد خاندانی وقار کو بڑی آن بان سے قائم رکھا۔ اور اپنی وفات کے بعد دو فرزند چھوڑے۔ حکیم محمد اکمل خان اور حکیم محمد اجمل خان اوّل۔

حکیم محمد اکمل نے علاج ومعالجہ میں بڑا نام پیدا کیا اور کمالِ فن کی وجہ سے دربارِ شاہی سے ان کو حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا۔

حکیم محمد شریف خان انہی حاذق الملک حکیم محمد اکمل خان کے لائق وفائق بیٹے ہیں۔ جن کے نام پر طب یونانی کی تاریخ میں ان کا خاندان انہی کے نام سے موسوم ہوا۔

پیدائش :-

خاندانِ مغلیہ کے دورِ آخیر میں محمد شاہ کی حکومت کے ابتدائی دور یعنی ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء میں حکیم محمد شریف خان تولد ہوئے

تعلیم وتربیت :-

ابتدائی تعلیم وتربیت حسب دستورِ زمانہ گھر کے علمی، ادبی اور سب سے بڑھ کر مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کی تکمیل کے لئے مشہور عالم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خاندان کے علماء کے سامنے زانوئے ادب میں سر خم کیا۔ فارسی و عربی نیز دیگر علوم و فنون مروّجہ کے بعد طب کی تعلیم کے لئے اپنے لائق و فائق باپ کے علاوہ اپنے عاقل و فاضل چچا سے رجوع ہوئے بھی نہیں۔ حسب فرمائش والد بزرگوار کے مزید تعلیم طب کے لئے حکیم عابد سرہندی اور اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب حکیم اچھے صاحب کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کیا۔

خدمات :۔

اس خاندان کی طبی حیثیت حکیم شریف خان کے زمانے میں بہت ممتاز ہوگئی تھی۔ اور حکیم شریف خان کا شمار بعہد محمد شاہ ایک فاضل و کامل طبیب اور مایہ ناز عالم کے ہوگیا تھا۔ یہ اپنے والد حکیم محمد اکمل خان کی مسند کے حقیقی جانشین ثابت ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیت سے اس فن اور مسندِ والد کو بلند تر کیا۔ دربارِ شاہی میں اثر و رسوخ اپنے کمالِ فن اور معراجِ طب کی وجہ سے حاصل کرکے اشرف الحکماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ساری حیات انھوں نے طب کی ترقی اور اصلاح کے لئے کوششیں کیں۔

حکیم محمود خان نے اپنی یادداشت میں خود اپنے قلم سے تحریر کیا ہے کہ "اُن کے جدامجد حکیم محمد شریف خان کو پانی پت اور ٹڈاسنہ کے علاقوں میں ۲۵ ہزار کی جاگیر ملی تھی۔

حکیم شریف خان کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب خاندانِ تختِ مغلیہ میں گھن لگ چکا تھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے فرنگی اقتدار نے سرزمین ہند پر اپنے پنجے گاڑنا شروع کردیئے تھے اور پایۂ تخت دہلی پر اس وقت مرہٹوں کا غلبہ تھا۔ اور صرف کہنے کو حکومت مغلیہ کی سلطنت تھی۔ دربارِ دہلی پر مرہٹوں کی پکڑ اس وقت اتنی زیادہ تھی کہ حکیم محمد شریف خان کو پانی پت اور ٹڈاسنہ میں ۲۵ ہزار کی جو جاگیر شاہ عالم سے ملی تھی اس پر بادشاہ وقت کی مہر کے اندر "مادھو راؤ سندھیا" کا نام "وکیل مطلق۔ مختار الملک۔ عمدۃ الامرا" اور "فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی" کے عنوان سے درج ہے وہ ۲۷ سال جلوس یعنی ۱۷۸۶ء تحریر شدہ

علاوہ تحریری تصنیفی۔ مذہبی طبی۔ اخلاقی کے فنی کمالات میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ زندہ جاوید یہ ہے کہ اُنھوں نے سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے طب یونانی کو بربادی سے بڑی حد تک محفوظ کرلیا۔ اور یہ خیال کرکے کہ اب شاہی دربار کی سرپرستی سے فن طب محروم ہوگیا ہے انھوں نے سوچنا شروع کردیا کہ اب کیا طریقۂ کار ہوسکتا ہے کہ دربارِ شاہی

کی سرپرستی کے سوا بھی طب یونانی کو کسی طرح باقی رکھا جا سکتا ہے۔"

حکیم شریف خان اور ان کی طبی حیثیت کا ذکر سرسید کی تصنیف "آثار الصنادید" کے علاوہ کسی تاریخ میں مکمل و مفصل نہیں ملتا ہے۔ دیگر تصنیف "فرحت الناظرین" میں دورِ مغلیہ کے حالات شروع تا آخر تک ملتے ہیں۔ لیکن حکیم شریف خان کے حالات زیادہ تفصیل سے کہیں بھی نظر نواز نہیں ہوتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ تاریخ ان سے اس قدر روشناس نہ ہوا ہو اور ان کو اس قابل نہ سمجھتا ہو کہ ان کا ذکر نمایاں حیثیت سے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور تاریخ داں اور مصلحِ قوم سرسید نے بھی حکیم شریف خان کی فنی خوبیوں طبی قابلیت کے ساتھ طبیب حاذق ہونے کا تو ذکر کیا ہے لیکن انھیں شاہی طبیب کی حیثیت سے نہیں گردانا ہے۔

شاہ عالم ثانی نے ان کو جو سندِ توصیفی اور جاگیر عطا کی تھی بہت ممکن ہے کہ شاہ عالم ثانی نے یہ سب حکیم محمد شریف خاں کی علمی قابلیت اور حکیم محمد شریف خان کا اپنی تصانیف و کتاب "تحفۂ عالم شاہی" یا "خواص الجواہر" کا انتساب شاہ عالم ثانی کے نام کی بنا رہی ہو۔ یعنی خطاب اور سندِ توصیف کا سبب عقیدت مصنف یا انتساب کتاب بادشاہ وقت ہو۔

حکیم شریف خان اپنے وقت کے جید بزرگ۔ محدث۔ فقیہہ۔ اور یگانہ روزگار طبیب تھے۔ انھوں نے فنِ طب میں ایک نئی روح پھونکی اور فنِ طب کو ایک نئی زندگی عطا کی۔

تاریخ میں اتنے بڑے حکیم کے حالات تفصیل سے کہیں نہیں ملتے ہیں سوائے ایک دو تاریخ کی کتب کے۔ اس کی نمایاں وجہ تاریخ بتانے سے بھی قاصر ہے۔

سرسید نے اپنی مشہور تصنیف تاریخی "آثار الصنادید" میں جو پہلی بار ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں زیورِ طباعت سے مزین ہوئی تھی۔ صرف ضمنی طور پر حکیم صادق علی خان کے تذکرے میں ان کا ذکرِ خیر کیا ہے۔

"وہ اپنے عصر میں سرآمد حکما، اور سرحلقۂ اطباء تھے۔ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبدِ دوار میں ازبس بلند ہے۔ جالینوس اور ارسطو کا غلغلہ

اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانے میں اور فی الحقیقت
اس روزگار کے اکثر اطبا، نامی انہی کی نسبتِ شاگردی سے سرمایۂ اعتبار
کار رکھتے ہیں ؎ ص۱۱۴
حکیم شریف خان نے ویدک کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس فن پر بھی متعدد کتابیں
لکھی تھیں۔ انھوں نے بعض ویدک مرکبات و کشتہ جات کو طبِ یونانی میں شامل
کیا اور بعض دیسی جڑی بوٹیوں کو بھی اس فن میں شامل کر دیا تھا۔

تصانیف :-

حکیم محمد شریف خان نے مختلف علوم و فنون کے ساتھ طب۔ مذہب۔ اور فن
ویدک پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔
حکیم شریف خان نے فن طب کی مایہ ناز تصنیف "علاج الامراض" کی وجہ سے
نہ صرف اپنے کو بلکہ اپنے لائق و فائق مصنّف کو بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے زندۂ جاوید
کر دیا۔ اور جو آج بھی اتنا وقفہ گذر جانے کے باوجود طب کی بنیادی کتاب شمار
کی جاتی ہے۔ اور جس کو حکیم واصل خان اوّل نے تحریر کرنا شروع کیا تھا حکیم
شریف خان نے تکمیل تک پہنچایا۔
ان کی طب کی تصانیف کی تعداد سات ہے جو اپنی حیثیت اور اہمیت میں مستحکم
ہے
طب کے علاوہ جہاں دیگر علوم میں ان کی تصانیف ملتی ہیں وہاں کلام مجید
کا ترجمہ انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کیا تھا۔ [illegible]
حیثیت ان معنوں میں بہت زیادہ ہے کہ پہلی بار ان کے ذریعے کلام پاک ایک
ایسی زبان میں ترجمہ ہوا جو ملک کی ابھی ابتدائی زبان تھی اور ابھی یہ زبان باوجود
مقبولیت کے ابھی اپنی ابتدائی منزل اور تشکیل میں تھی۔ لیکن حقیقت میں حکیم محمد شریف
خان کی عظمت فن طب کی بنیادی کتب میں حواشی لکھنے کی بنا پر پوشیدہ ہے۔
انھوں نے قانون شرح اسباب اور نفیسی پر حواشی بھی لکھے۔ ان حواشی سے
ان کی وسعتِ نظر تحقیق اور اصابت رائے کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں انھوں نے

بعض نہایت دقیق اور مختلف فیہ مسائل کے متعلق نہایت خوبی کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔

حکیم شریف خان نے تاریخ طب میں پہلی بار ایک ایسا جرأت مندانہ قدم اٹھایا کہ تاریخ میں حکیم شریف خان کا نام زندۂ جاوید ہو گیا۔

انھوں نے طب یونانی کو ہندی طب وید کے ساتھ مخلوط کیا اور اجداد میں حکیم واصل خان کے ذریعہ شروع کی جانے والی کتاب "علاج الامراض" میں نہ صرف اپنے بلکہ اسلاف کے ساتھ ساتھ دیگر معروف اطبا کے تجربات و معمولات کو مذکورہ کتاب میں یکجا کر دیا۔ اس کتاب میں تمام قدیم طب کی کتب کے نسخے جو مستعمل رہ چکے ہیں ان کو اور بعض مفید و موثر ویدک نسخے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

دستور دنیا ہے کہ جب کوئی قوم کسی دوسرے مقام پر منتقل ہوتی ہے تو اپنے ساتھ مقام اول سے تہذیب و تمدن تہذیب اور تاریخی اثرات لے جاتی ہے اور دوسروں کو اس سے متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ جانے پر وہاں پر پہلے سے موجود تہذیب و تمدن جغرافیائی تاریخی سیاسی سماجی اثرات کو قبول کرتے ہیں اور ایک نئی تہذیب کا وجود آتا ہے جو دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔

حکیم محمد شریف خان بھی اس سے نہ بچ سکے اور کشتہ سازی نیز دوسرے تجربات و مرکبات کو طب یونانی کے ساتھ شامل کر کے ہندی تہذیب کو اپنایا۔

نیز چونکہ حکیم محمد شریف خان نے فن طب پر بیش بہا کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ قرآن پاک کا اردو و فارسی میں ترجمہ کیا۔ انہی کے نام نامی و اسم گرامی کی نسبت سے خاندان شریفی کی ابتدا ہوئی۔ پھر نسل اپنی ذات میں ایک دور سمیٹے ہوئے آئی اور خدمت خلق و خدمت فن کے گہرے نقوش چھوڑتی ہوئی گزر گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے سکون و جمود کے بعد حکیم محمد شریف خان ایک مجتہدانہ دماغ لے کر پیدا ہوئے اور ان کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ انھوں نے اس دور تقلید اعمیٰ میں مسائل طب پر مجتہدانہ نظر ڈالی اور معاصر اطبا کی رد و قبول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے طب یونانی میں اصلاح و اضافہ کی نئی روح

پھونک دی۔

اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد شریف خاں کا مطب نہایت کامیاب مطب تھا شہرت دور دور تک جا پہنچی تھی نہ صرف ہندوستان سے بلکہ دور دراز ممالک جیسے ایران، افغانستان۔ بخارا اور حرمین شریفین تک سے مریض اور ان کے تیماردار آتے تھے۔

وفات:۔

۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں بعمر پورا اسی سال راہی ملکِ عدم ہوئے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار سے متصل مسجد کے جنوبی حصہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ عین اس وقت جب ان کو دفن کیا جا رہا تھا شاہ عبد العزیزؒ نے دخل الجنۃ بلد حساب سے سن وفات نکالا۔

حکیم غلام رضی خان نے بھی اسی جملے سے سن وفات نکالا۔

مختلف تاریخ دانوں نے مختلف اوقات میں ان کی وصال کی تاریخیں تحریر کی ہیں سیرت اجمل میں ۱۸۰۶ء تو بعضوں نے ۱۸۱۵ء سال وفات تحریر کیا ہے۔ یہاں تک کہ قاموس المشاہیر کا مصنف تو ان کے وفات کی تاریخ ۱۲۴۱ھ قرار دیتا ہے۔

لیکن یہ سب غلط ہے۔ حقیقت میں شاہ عبد العزیزؒ دہلوی محدثؒ کی تاریخ وفات کہی ہوئی موجود تھی تو دیگر تاریخیں قرینِ قیاس نہیں ہیں۔

پسماندگان:۔

جیسا کہ شجرۂ نسب سے ظاہر ہے کہ ان کی اولادوں میں تمام کے تمام اطباء اور ایسے اطبا، کہ جن کے علم وفن کا چاروں جانب ڈنکا بجا، پیدا ہوئے تھے۔

ان کے چھ صاحبزادے تھے۔

(۱) حکیم اشرف خان (۲) حکیم حسن بخش خان (۳) حکیم حسین بخش خاں (۴) حکیم صادق علی خان (۵) حکیم امام الدین خان (۶) حکیم شرف الدین خان۔

حکیم صادق خان حکیم شریف خان کے جانشین ان کے انتقال کے بعد مقرر ہوئے۔

طبّی معرکے:

حکیم شریف خان کے ذاتی تجربات و مشاہدات تو علاج الامراض میں درج ہیں ہی۔ چند ایسے واقعات علاج ہوئے جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

ایک بار محمد شاہ ثانی کو قبض کی شکایت ہوئی بادشاہ وقت نے کہا کہ ایسی دوا ہو جو غذا بھی ہو یعنی دوا، کی بدمزگی کی بنا پر وہ دوا نہ کھانا چاہتے تھے۔ حکیم شریف خان جو کہ باقاعدہ ابھی تک شاہی طبیب مقرر نہ ہوئے تھے بلائے گئے اور ان سے حالات بتائے گئے اور بادشاہ وقت محمد شاہ ثانی کی نبض حکیم صاحب نے دیکھ کر مندرجہ ذیل نسخہ لکھا۔

سیب تازہ لے کر کاٹ کر دو حصوں میں بیج نکال دیں اور قبض کشا دوائیں اس مقام پر جہاں سے بیج نکالے تھے بھر دی گئیں اور پھل گاڑ دیا گیا تھوڑے وقفہ کے بعد جب یہ پھل صاف کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے پھل (سیب) خیال کر کے کھا لیا۔ اب بادشاہ حکیم صاحب کا منتظر رہا کہ جواب دوا، یا کوئی چیز دیں تب کوئی شئے دیں۔

جب بادشاہ کو اجابت خوب کھل آئی تو بادشاہ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ اب دوا کی ضرورت نہیں ہے۔

حکیم شریف خان نے عرض کیا کہ حضور دوا، تو کھلا دی گئی اور یہ دوا ہی کا اثر ہے کہ آپ کا مرض (تکلیف) ختم ہو گئی ہے۔

دراصل سیب سے بیج نکال دینے کے بعد جو دست آور دوائیں بھری گئی تھیں اس کا اثر (Osmosis) طریقۂ عمل کے ذریعہ سارے سیب میں چلا گیا تھا۔

اسی طرح ایک بار پھر بادشاہ کو تکلیف ہوئی پرانی تمام شاہی طبیبوں نے کھانا منع کر دیا۔ ایسے موقع پر حکیم شریف صاحب کو تکلیف دی گئی۔ اس کے قبل بھی بار بار مرتبہ حکیم صاحب کو متعدد موقعوں پر شاہی افراد کے علاج کے لئے بلوایا

جا چکا تھا۔
حکیم شریف صاحب نے محمد شاہ عالم ثانی کی نبض دیکھی اور ایک حلوہ تیّار کر کے دے دیا۔

گلقند جس میں پانچ حروف ہیں

گل کے دو حروف یعنی پھول دو حصّہ اور قند کے ۳ حروف یعنی شکر ۳ حصّہ
جب حکیم صاحب نے یہ حلوہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تو بادشاہ نے کہا ؎

حلوہ خیلے خوب است

اور اپنے ہاتھ میں گلقند کا برتن لے لیا اور لذّت کی وجہ سے سارا حلوہ کھا گیا۔ جس سے خوب کھل کر اجابت ہوئی۔ اور مرض سے چھٹکارا مل گیا۔

حکیم مومن خاں مومن

۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ   جون ۱۸۵۱ء مطابق جمعہ رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ

شاعرِ باکمال و بے مثل طبیب

خاندان :-

مومن خاں مومن ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ میں چیلوں کے کوچے میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں ان کا آبائی مکان تھا۔ ان کے اجداد یعنی دادا حکیم نامدار خان اور حکیم کامدار خان کشمیر سے شاہ عالم کے زمانے میں چیلوں کے کوچہ دہلی میں (جو اکابرین کا مسکن اور مرکز تھا) آکر آباد ہوگئے تھے اور جنھیں اپنی طبی لیاقت کی بنیاد پر دربار میں شاہی طبیب کا درجہ مل گیا تھا اور دربار سے وابستہ ہونے پر ان کے دادا کو خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔ ان کے والد کا نام حکیم غلام نبی خان تھا۔ یہ نسلاً کشمیری تھے۔ اور قوم کے پٹھان تھے۔ ان کی پہلی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں احمدی بیگم سے ہوئی تھی۔ دوسری شادی شاہ محمد نصیر کی دختر انجمن النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ جس کی بناء پر یہ قیاس کیا جانے لگا کہ مومن خاں اہل سادات سے ہیں۔

صلہ خدمت کی بناء پر بادشاہ نے پرگنہ نارنول کے چند مواضعات جس میں موضع بلاسپور بھی تھا، بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ پھر بعد میں یہ دونوں خاندان نامدار خانی اور کامدار خانی کے ناموں سے منسوب ہوتے۔ یہ زمانہ مغلوں کے آخری دور کا تھا۔ انگریزوں کے زمانے تک یہ جاگیریں مومن خان کے خاندان والوں کے قبضہ میں رہیں۔ لیکن جب انگریزی سرکار نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خان

حکیم مومن خاں مومن

کو دی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے ان کی جائداد ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثا حکیم نامدار خان مقرر کر دی جس میں سے حکیم مومن خاں مومن کو پانچ صد روپیہ ترکہ خاندانی ملنے لگا۔

پیدائش :-

مومن کے والد حکیم غلام نبی خان کوچہ چیلان کے اپنے آبائی مطب میں مطب کرتے تھے۔ چونکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا مدرسہ بھی اسی محلہ میں تھا اور شاہ عبدالعزیز سے غلام نبی خان کے قدیمی خاندانی مراسم تھے۔ شاہ صاحب کی رفاقت نے حکیم غلام نبی خان کو خاصا مذہبی بنا دیا تھا جس کے اثرات مابعد مومن خان پر بھی پڑے۔

چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ عبدالعزیز صاحب کو بلا لائے اور ان سے بچہ کے کان میں اذان دینے کو کہا۔ شاہ صاحب نے نہ صرف اذان دی بلکہ بچہ کا نام بھی مومن خان رکھا۔ حالانکہ گھر کے دیگر لوگوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور اپنی پسند کا نام حبیب اللہ خان کشمیری رکھا لیکن نومولد نے شاہ صاحب کے نام سے نام پایا یعنی جب کامل طبیب ہو گئے۔ شعر و شاعری کا ذوق ہو گیا اور شعر موزوں کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور ان کے استاد نیز دوستوں نے بھی یہ نام پسند کیا اور جب سب نے پسند کیا تو خدا نے بھی پسند کیا اور مقبول ہوا یہاں تک کہ یہ اپنے اعمال صالح کی بدولت واقعی حبیب اللہ ہوئے اور بہ شان مومن دنیا سے اٹھے۔

تعلیم و تربیت :-

مومن کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا بچہ ابتدائی تعلیم شاہ صاحب کے مدرسہ میں شروع ہوئی جو ان کے محلہ کوچہ چیلان میں واقع تھا۔ اس کے بعد شاہ عبدالقادرؒ کے مدرسے میں ان کی خدمت میں پہنچائے گئے اور یہیں عربی۔ فارسی۔ حدیث فقہ۔ منطق۔ معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔

مومن کو بچپن سے ان بزرگوں سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ تعلیم حاصل کرنے

کے ساتھ ساتھ وہ ان کے وعظ بھی سنتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ
" ذہنِ خدا داد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کا وعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکاتِ
باطنی سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ بے فرق اپنے والد بزرگوار حکیم غلام نبی خان کے مطب
میں بیٹھ کر ان کے سامنے دہرا دیتے تھے۔" مزا تو یہ تھا کہ مومن نکاتِ باطنی اور
اسرارِ سینہ کو بھی اس طرح بیان کر دیتے تھے۔ جس کی جھلک حضرت شاہ صاحب
کی تفسیر نا تمام میں موجود ہے۔

غرضکہ مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں
نے ان کے سائے میں نہ صرف مختلف علوم سے واقفیت پیدا کی بلکہ روحانی
فیض بھی حاصل کیا۔ اسی لئے مومن زندگی بھر حضرت شاہ صاحب کے احسانمند
رہے۔ انھوں نے ہمیشہ شاہ صاحب کا نام عزت سے لیا ہے اور ان کی تعریفیں
کرتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات پر جو تاریخ انھوں نے کہی ہے اس
کے اشعار سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے شاہ
صاحب کو وحید الزماں اور یکتائے دوراں کہا ہے۔

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز ۔۔۔ بے عدیل و بے نظیر و بیمثال و بیمثل
جانبِ ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے ۔۔۔ آگیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو بہانے لے گیا ۔۔۔ کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہہ و بالا ہوا ۔۔۔ ٹوٹتا تھا خاک پر یہ فرسی گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن ۔۔۔ ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلس در آفرین تعزیت میں میں بھی تھا ۔۔۔ جب پڑھی تاریخ یہ مومن نے آ کر بے بدل

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس قطعہ کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت نے اُن پر
گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ اسی لئے انھوں نے زندگی بھر ان کی شخصیت کو
فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم اور علم و عمل کا منبع سمجھا۔ اس کی بدولت مومن
میں بھی بعض ایسی خصوصیات پیدا ہوتیں جن کو ان کی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ

سمجھنا چاہیئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ جیسے منارہ علم و ادب سے زانوئے ادب طے کرنے اور کتب فیض حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی پیشے طبابت کی جانب متوجہ ہوئے۔ چونکہ مختلف اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی میں خاصی دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اس لئے جب انھوں نے طبابت کی جانب توجہ دی تو اس میں بھی بہت جلد کمال حاصل کرلیا۔

طبی تعلیم :-

چونکہ طب کے ماہر خود ان کے خاندان میں ان کے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم غلام نبی خان اپنے زمانے کے ماہر طب اور اعلیٰ طبیب تھے۔ انہی سے مومنؔ نے طبابت سیکھی اور ان کے دواخانے میں نسخہ نویسی یعنی مریض کو دیکھنا اور ان کے مرض کے مطابق نسخہ لکھنا سیکھا۔ مومنؔ نے کچھ وقت اسی طرح گذارا اور بہت قلیل عرصہ میں خود ایک اعلیٰ اور ایک طبیب کامل کی حیثیت سے وہ بہت جلد مشہور ہوگئے۔

کریم الدین نے لکھا ہے کہ" حکیم اس پایہ کے کہ بوعلی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت سیکھنے میں گنوائے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پائے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے طبیب حاذق سمجھے جاتے تھے اور ایک طبیب کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بھی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے علوم و فنون سے بھی ان کی گہری دلچسپی کا پتہ لگتا ہے۔

مومن خان کے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم غلام حسن خان کا مدانی خاندان سے تھے چونکہ دونوں اپنے زمانے کے مشہور و معروف اور جید طبیب تھے ان کی قدر و منزلت بہت تھی اور اپنے وقت کے مانے ہوئے طبیب تھے۔ سرسید نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

ارشد تلامذہ حکیم شریف خان سے ہیں۔ مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت میں حل ہوئے ہیں۔ غالب یوں ہے کہ اس جزو زماں میں اور

کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذۂ کرام مثل مولانا مخدومنا مولوی عبدالعزیز صاحب دہلوی اور مولوی رفیع الدین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ سے سالہا سال تک استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کیئے۔ شفائے کامل ان کے دست حق پرست میں ودیعت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبتِ شاگردی حاصل ہے۔"

اور اسی طرح حکیم غلام حیدر خان کے بارے میں لکھا ہے کہ "حکیم غلام حیدر خان موصوف بصفات کمال کتب طبّیہ میں مہارت۔ تام علاج و معالجے میں دستگاہ تمام رکھتے تھے۔ تحصیلِ فنِ طب حکیم شریف خان سے کی تھی۔ اب عرصہ چند سال کا ہے کہ اس جہان سے عالمِ باقی کی طرف روانہ ہوئے۔"

چونکہ حکیم کے معنی ہوتے ہیں تمام علوم پر قدرت رکھنے والا۔ خدا کی ذات کو چھوڑ کر دیگر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے لیکن حکیم اپنی علمی قابلیت کی بنا پر تمامی علوم سے بہم واقفیت رکھتا ہے۔

دیگر علوم :-

حکیم مومن کو علمِ نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ علمِ تنجّم کے اہلِ کمال سے اس علم کو سیکھا اور مہارت بہم ایسی پہنچائی کہ احکام سنکر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے اور نہ ہی تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے تم خاموش رہو۔ جو میں کہتا جاؤں اس کا جواب دیتے جاؤ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر ان کو تسلیم کرتے جاتے تھے۔

ان کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ واقعی نجوم کے بہت بڑے ماہر تھے " واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ حکیم مومن خان مومن کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اس وقت موجود تھے خان صاحب (حکیم صاحب)

نے اسے دیکھ کر کہا کہ "تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟" اس نے کہا "صاحب میں لٹ گیا۔"
کہا "خاموش رہو۔ جو میں کہوں اسے سنتے جاؤ۔ جو غلط بات ہو اس کا انکار کر دینا۔"
پھر پوچھا کہ زیور کس قسم سے تھا؟"

"صاحب ہاں، وہی عمر بھر کی کمائی تھی!"

کہا "تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے کوئی غیر چرانے نہیں آیا ہے۔"
اس نے کہا "میرا مال تھا اور میری بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چرائیں؟"
ہنس کر فرمایا "کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر نہیں گیا۔"
اس نے کہا "صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا۔ کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔" فرمایا پھر دیکھو۔
وہ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا "صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے ایک ایک کونہ دیکھ لیا کہیں پتہ نہیں لگتا۔" خان صاحب نے کہا اسی گھر میں ہے تم غلط کہتے ہو۔

کہا۔ آپ چل کر تلاشی لے لیجئے۔ میں تو ڈھونڈ چکا۔

فرمایا۔ یہیں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر سارا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔
وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا پھر کہا۔ اس گھر کے جنوب کے رخ ایک کوٹھری ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے اس کے اوپر مال موجود ہے جا کر لے لو۔ اس نے کہا مچان کو تو میں نے تین دفعہ چھان مارا ہے۔ وہاں نہیں ملا ہے۔ فرمایا۔ اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ غرض جب گیا اور روشنی کر کے دیکھا تو ڈبہ اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا۔

منجم جس اعلیٰ پائے کے تھے ویسے ہی حکیم مومن خان مومنؔ ایک اچھے عامل بھی تھے گنڈہ تعویز بھی دیا کرتے تھے۔ سارے شہر میں دھوم تھی۔ مومن خان کی علم نجوم سے واقفیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے جو انھوں نے دیباچہ تقویم سال ہزار دو صد و پنجاہ دو صد کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس دیباچہ میں انھوں نے علم نجوم کے مختلف پہلوؤں پر نہایت ہی عالمانہ سیر حاصل بحث کی ہے۔

نجوم کے ساتھ ساتھ علم رمل سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ علم رمل میں ماہر و یکتا ہونے کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی طرح ہو جائے گا۔

•

حکیم مومن خاں مومنؔ کے شاگرد رشید رمل عرشؔ گیاوی جنھوں نے اپنے استاد پر حیاتِ مومنؔ تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"حکیم مومن خاں مومنؔ کا دربار لگا ہوا ہے۔ مختلف علوم وفنون کے شائق دامنِ طلب پھیلائے ہوئے ہیں کہ دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہے۔ خاں صاحب راقم کو فرماتے ہیں۔ بھئی ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب ہٹے گی۔ وہ زور لگا کر کہتے ہیں۔ حضور یہ ابھی جاتی ہے۔ خاں صاحب شطرنج کھیل رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں اور دیوار کی طرف دیکھ کر حکم لگاتے ہیں۔ واہ جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے۔ کیونکر جائے گی۔ دیکھو اور پھر دیکھو۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بالا خانے پر جہاں خاں صاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ریشمی کپڑوں کے دو گٹھڑ لئے ایک سوداگر آتا ہے (خاں صاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کم از کم پائجامہ ریشمی ضرور پہنتے تھے۔)

سوداگر جوں ہی مزدور کے سر سے ایک گٹھ کپڑے کا پورب والے دروازہ سے داخل ہو کر کمرے میں اتارتا ہے۔ گانٹھ سے ایک چھپکلی پٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی سے جا ملتی ہے۔ پھر دونوں چھپکلیاں مل ملا کر ایک جانب کا راستہ لیتی ہیں۔

عرشؔ گیاوی صاحب عالم تحیّر میں حکیم مومنؔ کا منہ دیکھتے ہیں وہ مسکرا کر فرماتے ہیں۔ "میاں ہنوز دلّی دور است"۔ تم چاہتے ہو کہ شاعری کی طرح اس کو بھی حاصل کر لوں تو یہ مذاق نہیں۔"

حکیم مومنؔ نے ان علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی کا فن بھی حاصل کیا تھا۔ نظیر [illegible] جو اس زمانے میں استاد تھا حکیم مومنؔ کے انتقال پر بین اٹھا کر صرف اس لئے رکھ دی تھی کہ اب دلی میں اس کا کوئی قدر دان نہیں رہا۔

شطرنج کے کھیل کو بھی انھوں نے ایک علم اور فن کی طرح سیکھا تھا اور اس میں بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ آبِ حیات میں مولانا محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے کہ شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جایا کرتے تھے۔ دلّی کے

مشہور شاطر کرامت علی خان سے قرابت دیرینہ رکھتے تھے اور شہر کے دو چار مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

شعری و ادبی ذوق :-

یوں تو مومن نے کئی علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ اس لیئے اپنی زندگی ـــــ میں سب سے زیادہ انھوں نے شعر و شاعری کے فن میں پھر اس کے بعد طب کے فن میں دلچسپی لی۔ انیسویں صدی کے دلّی ـــ کے مخصوص شاعرانہ ماحول میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ مومن کو شعر و شاعری سے طبعی مناسبت تھی اور وہ اس فن کے ساتھ فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی عمر سے ہی انھوں نے اس صنف کے ساتھ دلبستگی پیدا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس دلبستگی نے ان کے یہاں شعر کہنے اور شاعری کا شوق پیدا کیا۔ آس پاس اور گرد و پیش کے شاعرانہ ماحول نے اس آتشِ شوق کو بھڑکایا۔

شاہ نصیؔر سے بہت مختصر عرصہ کسبِ سخن حاصل کرنے کے بعد خود اپنے علم کی بدولت استادی گر کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ اور تمام افراد پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ یعنی کہ مومن نے بہت جلد شعر و شاعری میں کمال حاصل کر لیا اور وہ تمام اصنافِ سخن پر قادر ہو گئے ـــ انھوں نے غزلیں کہیں مثنویوں کی تخلیق کی۔ قصیدے لکھے۔ مسدس۔ مخمس۔ رباعی۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ سب کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی۔ اور اس زبان میں بھی مختلف اصناف کو چار چاند لگا دیئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا ایک قادر الکلام اور خوش فکر شاعر اپنے آپ کو تسلیم کرا لیا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے زمانے کے استاد سمجھے جانے لگے۔

ان کے والد ماجد کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہوا تھا۔ مومن نے ان کے انتقال پر ایک قطعہ تاریخ فارسی میں کہا۔

پدرم شد اسیرِ دامِ اجل ــــــ روحش از منہ آخشیجاں دربست

طائرے بود آسماں پرواز رفت بر شاخسار قرب نشست
بہ من الہام گشت سالِ وفات
کہ غلام نبی بہ حق پیوست

اور اردو میں "شور انگیزی قلم سنہ چاک اشک فشاں در ماتم حکیم غلام نبی خانؒ" کے عنوان سے ایک تاریخ کہی۔

جہاں نکوئی نکو بے جہاں | وحید زماں والدِ مہرباں
یہاں تک انھیں شوقِ خلدِ بریں | کہ ہر دم کو گنتے دم واپسیں
نہ دل میں نہ ان کے زباں پر کبھو | رضائے الٰہی سوا آرزو
غرض آ گیا وقتِ موعود جب | گئی تن سے وہ جانِ عشرت طلب
تاسف نے کیا کیا ستایا مجھے | قلق نے زمیں پر لٹایا مجھے
غضب جان کو بے قراری ہوئی | بری حالت ایسی ہماری ہوئی
کہ دکھا دلِ عشرت آلود مرگ | ہوئی زندگی اپنی محسود مرگ
جہاں سے جب ایسا شفیق اٹھ گیا | تو جینے کا سچ ہے مزا کیا رہا
کہوں کیا کسی سے کہ کیا غم ہوا | سزاوار اشفاق ماتم ہوا
ولے شعر کی جو ہوس ہے کمال | اسی غم میں تاریخ کا تھا خیال

جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آہ
توفَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا کہا

ان قطعات تاریخ سے مومن کے والد کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک خصال آدمی تھے۔ لوگوں کو ان سے محبت تھی۔ زمانہ ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ بڑے شفیق اور مہربان باپ تھے۔ انھیں ہر لحظہ خلدِ بریں کا خیال رہتا تھا۔ رضائے الٰہی کے سوا ان کے دل میں کوئی اور آرزو نہیں تھی۔ غرض وہ بڑے نیک دل اور صاف باطن انسان تھے انھیں صحیح معنوں میں جنتی کہنا چاہیئے۔

والد کے انتقال کے وقت مومن کی عمر ۲۶ سال تھی۔ ظاہر ہے کہ والد کی وفات کے بعد وہ بے یار و مددگار ہو گئے ہوں گے۔ اور ساری ذمہ داریاں

انہیں اٹھانی پڑی ہوں گی۔ انشائے مومن میں انھوں نے ایک خط اپنی عزیزہ یعنی حکیم احسن اللہ خان کی ماں کے نام لکھا ہے۔ اس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سانحہ پر روشنی ڈالی ہے۔

نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ ایک مایہ ناز طبیب کی حیثیت سے بھی حکیم مومن خان مومن نے اپنے زمانہ میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔ وہ شاعری کو اظہارِ جذبات کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس سے کبھی کچھ حاصل کرنے کی سعی نہیں کی۔ انھیں کبھی کسی دربار میں داخل ہونے کا خیال نہیں آیا۔ لال قلعہ اس زمانے میں شاعری کا مرکز تھا۔ لیکن شاعری کے سہارے انھوں نے قلعے تک جانے کی کبھی آرزو نہیں کی۔ خاندانی شاہی طبیب ہونے کا بھی کبھی فائدہ نہ اٹھایا۔ اس زمانے کے کئی رئیسوں نے انھیں ملازم رکھنا چاہا۔ لیکن انھوں نے ملازمت قبول نہیں کی۔ کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ کچھ حاصل کرنے کے خیال سے کسی کی مدح نہیں کی۔ ان کے زمانہ کے امراء و رؤسا اس بات کے لئے کوشاں رہتے تھے کہ انھیں کسی طرح اپنے پاس ملازم رکھ لیں۔ لیکن یہ تیار نہ ہوئے۔ ملازمت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو انھیں پسند نہ تھی۔ اسی لئے جب کبھی بھی ملازمت کا سلسلہ ہوا تو انھوں نے کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی غیور طبیعت تھی۔ وہ کسی کے دستِ نگر بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ مزاج میں آزادہ روی تھی۔ اس لئے ملازمت کی پابندیوں کو برداشت کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ مومن کو والئ رامپور، والئ ٹونک، والئ بھوپال، والئ جہانگیر آباد وغیرہ نے اپنے دوستانہ جال میں پھنسانا چاہا۔ مہاراجہ کپور تھلہ نے ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار پر طلب کیا۔ مگر وہاں بھی نہ گئے۔ زادِ راہ تک واپس کر دیا۔

ریاست ٹونک کے وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خان نصرت جنگ بہادر کو مومن سے نسبت خاص تھی۔ وہ ان کے پیر بھائی ہوتے تھے۔ انھوں نے بلانے کی بہت کوشش کی۔ مومن نے معذرت کے طور پر ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا۔ اور اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے انکار کر دیا۔ قصیدے کے یہ

اشعار بڑے معنی خیز ہیں۔

یادِ ایامِ عشرتِ فانی | نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں | کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون | بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں | کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار | کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی
نہ ملا کچھ نشانِ آبِ زوال | خاک سارے جہان میں چھانی

میرے گوہر تمام نا سفتہ | میرے یاقوت سب بدخشانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں | جس کے در کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں ہے کہاں
میری تقریر کی سی تابانی

اسی طرح انگریزوں نے جو مدرسۃ العلوم دہلی کالج کے نام سے قائم کیا تھا اس کالج میں فارسی مدرس کی جگہ بھی حکیم مومن صاحب کو پیش کی گئی تھی لیکن اس کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ مومن بڑے خوددار آدمی تھے۔ اس خودداری نے انھیں مادی ضرورتوں سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ کئی علوم کے ماہر تھے۔ چاہتے تو ان میں سے کسی کو بھی اپنا ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف شاعر تھے اور شاعری کو کسی مقصد برآری کے لئے ذریعہ بنانا ان کے نزدیک مناسب نہیں تھا۔

حکیم مومن خان مومن کے نزدیک شعر و شاعری محض تفریحِ طبع کی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اس فن کے تمام پہلوؤں سے انھیں لگاؤ تھا۔ وہ اس فن کے تمامی اسرار و رموز کو جانتے تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ نہ انھوں نے ایسی باتیں کیں جو عام طور پر شاعر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے زمانے میں دلّی کی سرزمین

پر بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی سے بڑا نہ سمجھا۔ ان کی چشمک کسی سے نہ تھی۔ سب ان کی عزت کرتے اور انھیں عزیز رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مومن پر کسی نے اعتراضات نہیں کئے۔ زندگی بھر ان سے کوئی الجھا نہیں۔

غالب کی شاعری کا اُس زمانے میں شہرہ تھا اور بلاشبہ اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر غالب تھے۔ ان کے سامنے شاعری کا اعلیٰ و ارفع تصور تھا اس لئے وہ ذرا مشکل ہی سے کسی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ غالب نے اپنے زمانے میں صرف حکیم مومن خان مومن کے جوہر کو تسلیم کیا ہے اور صرف ان کو ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر مانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حکیم مومن خاں مومن کی جب یہ غزل دیکھی جس کا مطلع یہ ہے

اثر ان کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اور جب غزل کا یہ شعر ان کی نظر سے گذرا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ کاش حکیم مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دے دیتا۔ غالب جیسے سخن شناس کا اپنے ہم عصر حکیم مومن کے متعلق یہ اظہار صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہیں حکیم مومن خان مومن کی شاعری سے دلچسپی تھی۔ اور وہ انھیں ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر خیال کرتے تھے۔

حکیم مومن خان مومن میں خودداری خود اعتمادی اور خدا اعتمادی حد درجہ تھی۔ کبھی کسی امیر۔ رئیس یا دربار میں صلہ کے عوض نہ تو گئے اور نہ ہی کوئی توقع رکھی۔ اسی لئے ایک دو کے سوا کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کی خودداری کا ایک واقعہ درج ہے۔

راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں مشہور تھیں وہ ایک دن اپنے مصاحبوں کے ساتھ سرِ راہ اپنے

کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خان صاحب کا ادھر سے گذر ہوا۔ مصاحبوں نے کہا "حکیم مومن یہی شاعر ہے۔" راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ کچھ نجوم شعر و شاعری اور امراض و علاج کی باتیں کیں اور حکم دیا کہ ہتنی کس کر لاؤ۔ ہتھنی کس کر لائی گئی۔ وہ حکیم صاحب کو عنایت کی۔ انھوں نے کہا مہاراج میں غریب آدمی ہوں اسے کہاں سے کھلاؤں گا؟ اور کیونکر رکھوں گا۔ مہاراج نے کہا سَو روپیہ اور دو۔ حکیم مومن اسی ہتھنی پر سوار ہو کر گھر آئے اور پہلے اس کے کہ ہتھنی روپیہ کھائے اسے بیچ دیا۔ پھر حکیم صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ تشکریہ لکھ کر راجہ صاحب کو روانہ کیا جس کا مطلع یہ ہے ؎

صبح ہوئی تو کیا ہوا وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں شاعر تھے اور شاعری کو دنیا وی عزت دولت اور شہرت کے لئے وسیلہ بنانا انھیں ناپسند تھا۔ ویسے وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ایسی دردناک اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔

پسماندگان :۔

حکیم صاحب کی پہلی زوجہ محترمہ سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری اہلیہ صاحبہ سے ایک دختر جن کا نام محمدی بیگم تھا اور کئی صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا انتقال حکیم صاحب کی حیات میں ہوا لیکن ایک صاحبزادے خواجہ نصیر خان کی عمر جب چھ یا سات سال کی تھی تب حکیم مومن خان مومن کا انتقال ہو گیا تھا۔ دوسرے صاحبزادے عبدالوہاب جو عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد فقر کی جانب رجوع ہوئے ان پر عرصہ تک جذب کی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں انتقال کیا۔

شاگرد :۔

شاعری کے فن میں حکیم مومن نے اپنے زمانے کے بعض اہم شاعروں کی رہنمائی

کی۔ ان کے کچھ شاگرد تو خاصے مشہور ہوئے ہیں جنھوں نے اس زمانے میں بھی خاصا نام پیدا کر لیا تھا۔ حکیم مومن کے شاگردان رشید کی فہرست طویل ہے ان میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سرِ فہرست ہے۔

دیگر شاگردوں میں حکیم سید منور علی آشفتہ۔ میر عبدالرحمن آہی۔ خلف میر حسین تسکین۔ حکیم مولا بخش تلاق میرٹھی۔ نواب عباس علی خان۔ بیتاب رام پوری۔ شیخ علی بخش بیمار۔ مرزا غلام فخرالدین شہور۔ قاضی نجم الدین برق۔ مرزا محمود بیگ راحت۔ سعادت علی خان راسخ۔ مرزا قربان علی سالک۔ ظہور علی ظہور۔ عظمت اللہ عظمت۔ غلام احمد شورش۔ میاں جان دہلوی صفیہ۔ مرزا خدا بخش قیصر۔ شیخ غلام علی کرم۔ اصغر علی خان نسیم۔ غلام علی خان وحشت۔ فخرالدین یاس قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے تو خود استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ مومن نے اپنی پانچویں مثنوی حسین مغموم میں ان کا ذکر یوں کیا ہے۔

کون سے شاگرد ہیں استاد فن	بے سخن ہے دہر با جن کا سخن
وحشت و مضطر کرم تسکین و یاس	بے خودی میں بھی ہیں جنکے بدحواس
اکبر و عظمت۔ سہ افراز سخن	پایہ بالاتر بر افراز سخن
باعث نازو غرور روزگار	میرے مشفق میرے مونس میرے یار
شیفتہ سر دفتر اہل قلم	نکتۂ خاطر نشاں جس کا رقم
بے عدیل و بے سہیم و بے بدل	بے نظیر و بے مثال و بے مثل
رازدانِ نکتہ ہائے کس مدان	مغنی کرسی نشین خاطر نشان

ہم نفس ہمدم رضا جو دوستدار
شیفتہ دلدادہ والہ جان نثار

غرضکہ مومن کو اپنے شاگردوں پر فخر تھا۔ ان میں سے بعضوں کو وہ اپنا بہت اچھا دوست بھی سمجھتے تھے اس زمانے کی زندگی میں ان کی شخصیتیں اہم حیثیت رکھتی تھیں۔ مومن سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا اسی لئے ان سب کے دلوں میں حکیم صاحب کی بڑی عزت تھی اور خود مومن ان شاگردوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ اُن سب نے مل کر اُس صحیح شاعرانہ ماحول کو پیدا کیا تھا۔

جو مومن کو بہت عزیز تھا اور جس کے بغیر مومن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

انتقال :-

ایک دن حکیم مومن خان کے مکان کی مرمت ہو رہی تھی اور سامان ہٹایا جا رہا تھا۔ یہ اس چھت کی منڈیر سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ چھت کی اونچائی کم تھی۔ یکایک جھکے اور ٹھوکر کھا کر کوٹھے سے نیچے گر پڑے۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو فرمایا۔ میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا مگر میرا علم کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے جیوں گا۔ لو مرنے کی تاریخ لکھ لو۔

دست و بازو بشکست ۱۲۶۸ھ

آخر وہی ہوا۔ جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا۔

عمر کے لحاظ سے جب کہ قبل غدر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان معلوم ہوتا تھا یہ محض ترپن برس کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس بینتالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ نماز جنازہ جامع مسجد میں ہوئی۔ حسب ہدایت ان کا جنازہ دلی دروازہ مہدیوں کے شہر خموشاں میں جو کہ دہلی کا پرانا گورستان ہے دفن کیا گیا۔ یہ وہی قبرستان ہے جہاں شاہ ولی اللہؒ۔ شاہ عبدالعزیزؒ۔ شاہ عبدالقادرؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگ دفن ہیں۔

شہر کے امیر غریب علماء، فضلا، شعراء، اطباء، شہزادے سب جنازے کے ساتھ تھے اور سب نے ان کی جواں مرگی کا سوگ منایا۔ غالبؔ تو غالبؔ ذوقؔ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا کہ دہلی کا چراغ بجھ گیا۔

مومنؔ کی موت ایک شاعر، ایک اختر شناس اور ایک رند پارسا ہی کی موت نہیں تھی۔ ایک آدمی ایک انسان ایک دوست اور ایک محب اسلام کی موت بھی تھی۔ ان کی موت نے سارے ماحول کو متاثر کیا۔ بڑے بڑے شاعروں نے تاریخیں کہیں اور اس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے انتقال کا دلی کے ہر شخص کو غم ہوا۔ کیونکہ انھوں نے اپنی دلکش شخصیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لی تھی۔ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ ان کی شخصیت مرنجانِ مرنج تھی۔ وہ کسی

کی اچھائی اور برائی میں نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی کسی سے لڑائی مول نہیں لی۔ کبھی کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ کبھی کسی سے الجھے نہیں۔ کسی کی ہجو نہیں لکھی۔

بقول غالب لوگ ان کے غم میں کعبے کی طرح سیاہ پوش ہونے کے لئے مجبور ہو گئے۔

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر خون نابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر

کافر باشم اگر بہ مرگ مومنؔ چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

یہ مشہور ہے کہ مرنے سے بہت پہلے مومنؔ کو اپنی وفات کا علم ہو گیا تھا۔ علم نجوم اور رمل کے ذریعہ سے انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ تک نکال لی تھی۔ چنانچہ یہ تاریخ ان کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اردو کے صاحب دیوان شعراء میں صرف حکیم مومن خان مومنؔ ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے دیوان میں بعض ایسے قطعات ہیں۔ جن میں انھوں نے طب کی تمام اصطلاحوں اور تشبیہات کو واضح کیا ہے۔ اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے طب کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انشائے مومنؔ میں حکیم احسن اللہ خان کے نام بعض ایسے خطوط ہیں جن میں انھوں نے طبی معاملات و مسائل پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔

مواد شوق زیارت تمکین مغز فلوس مداوا اخراج نمی یابد چہ چارہ و ستدہ احشائے پیچ و تاب حسرت دیدار بہ ستمونیا تقریر دلکشا نمی کشاید چہ تدبیر خونی بہ دل جوش می زند۔ برص نامہ را در ربانے نیست انا علم حرکت نذبوحی وارد۔ خامہ را جنبش شہ ریانی ..... برزنا نم رفت۔

حکیم احسن اللہ خان کو مندرجہ بالا مکتوب اس طرح تحریر کیا ہے کہ طبی اصطلاحات سے بھرپور کوئی نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

اعصاب محو زلف شکن در شکن ہوئے
گردن میں ہے تشنج اقدام سے کزاز — !
میں کیا کہوں حقیقت رنگ عذار زرد
سمجھو تو صفرت یرقان اس سے ہے مجاز — !

منھ کا مزا یہ تلخ کہ شیریں ہے اس سے تو
بے وجہ سرکہ رو دیتے زہادِ حیلہ ساز ـــــ!
صندل سے دردِ سر کو کہا جب تلک جبیں
میں اس کے آستاں پہ نہ رگڑوں بصد نیاز ـــ!
ہاں شوقِ سرکہ روئیے ہندی صنم ہے خاک
صفرا شکن ہو سرکۂ انگوری مجاز ـــــ!
یاں بوسے چاہیں گرہِ زلفِ یار کے
ممکن نہیں کہ دانۂ آلو ہو چارہ ساز ـــــ!
لازم ہے تیرے سینے پہ رخسارِ ماہ وش
کافور کی ہو قرص سے کیا چارۂ فراز ـــــ!
جھوٹی شرابِ یار کی درکار ہے کہاں
تسکین پذیر ہو عرق بید سے جواز ـــ!
اس جائے بوسۂ شکریں لب کا کام ہے
گل قند سے کیونکر طبیعت کو احتراز ـــ!

ایک قطعہ میں اپنا حال اس طرح بیان کیا ہے ۔

ہوا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بے درد کو لکھوں
کہ مجھ کو تختۂ مشقِ اطبّاء کیوں بنایا ہے
نہ یہ سمجھیں سبب نے کچھ علالت سے مرض پاویں
پڑے ہیں آپ مالیخولیا مجھ کو بتایا ہے
کوئی کہتا ہے کہ آلودہ کہ صفراء کی گرانی ہے
سیاہ رُو نے سنہرا رنگ جو چہرے کے پایا ہے
کوئی کہتا ہے لنٹرغش ہوا جب بے خودی چھائی
مجھے وسواس سرسام درو غیں سچ ہی آیا ہے
کوئی کہتا ہے میں سمجھا یہ سر جو اُٹھ نہیں سکتا
ہزالِ روحِ انسانی نے یارو سر اٹھایا ہے

یہ سودا عشق ہے تیرا یہ تپ سوزِ غریبی ہے
کہ بے جا گرمیٔ صحبت نے تیرا جی جلایا ہے

صداع و صدر کا باعث بھی تیری بد دماغی ہے
اگرچہ مبحث ناصح نے بھی سر کو پھرایا ہے

یہ طویل قطعات صرف اس مقصد سے یہاں نقل کئے گئے ہیں کہ ان سے مومن کی یہ تصویر سامنے آجائے کہ حکیم مومن خان صرف عشق و معشوق کے شاعر نہیں تھے، بلکہ کامل طبیب ہیں۔

ان میں طب کی تمام اصطلاحوں کا ذکر ہے۔ تمام امراض کا بیان ہے۔ مومن نے اپنے عمِ بزرگوار کو ان دونوں قطعوں میں بہت بڑا طبیب بتایا ہے۔ لیکن وہ بھی ان کے مرض کا علاج نہ کر سکے۔

تصانیف :-

مومن کا اردو کلام تو ان کی حیات میں ہی ان کے شاگرد مصطفیٰ خان شیفتہ نے ترتیب دے کر اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کر ان کی زندگی ہی میں شائع کر دیا تھا۔ لیکن فارسی کلام حکیم احسن اللہ خان نے ۱۲۷۱ھ میں مومن کی وفات کے تین سال بعد مطبع سلطانی میں اپنے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔

مومن کے اردو کلیات میں صرف ۹ قصیدے ہیں ان میں سے سات کے موضوعات دینی ہیں۔ صرف دو قصیدے دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں ہے۔ ان میں [illegible] نے قصیدے کا روایتی انداز اختیار نہیں کیا ہے برخلاف اس کے [illegible] کہی ہیں جن سے ان کے مخصوص مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ [illegible] عام قصیدوں کے مقابلے میں مختلف نظر آتے ہیں اور ان میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔

قصیدوں کے بعد اس کلیات میں غزلوں کا حصہ ہے اور اس حصہ میں مومن کی کل دو سو اٹھارہ غزلیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ غزلوں کے بعد قطعات رباعیات اور چند معمے ہیں۔

دیوانِ مومن میں مومن خان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔
پھر کچھ تاریخیں ہیں ان تاریخوں کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ انشائے مومن۔
مومن کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے ان خطوط کو حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا
تھا اور اپنا ایک دیباچہ شروع میں درج کیا ہے۔ یہ تین ابواب پر مشتمل کتاب ہے۔
حکیم مومن خاں مومن طبیب تو تھے ہی لیکن وہ پیدائشی شاعر تھے اور غزل
ان کا خاص میدان تھا۔

طبّی معرکے :۔

حکیم مومن خان مومن اپنے اجداد کے آبائی مطب میں مریضوں کا معائنہ کر رہے
تھے کہ ایک خاتون جو اربابِ عیش و نشاط کے طبقہ سے متعلق تھیں تشریف لائیں اور
مستورات کے گوشہ میں جا بیٹھیں۔ وہ غائبانہ طور پر حکیم مومن خان مومن کی رنگین
شاعری کی مدّاح تھیں اور علاج و معالجہ کی معتقد۔
حکیم صاحب کے چند شاگردانِ رشید جو عام طور پر دواخانہ کی زینت بنے
رہتے تھے اور احباب جو گاہے گاہے مطب میں آکر حکیم صاحب سے فیضیاب ہوتے
تھے۔ مریضوں سے رخصت ہونے کے بعد دریافت کیا کہ فلاں خاتون کون تھیں؟
مریضوں کے اژدہام میں حکیم صاحب بغور کسی مریض پر ذاتی حیثیت سے توجہ
نہ دے سکتے تھے۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا کون مریضہ؟
احباب نیز شاگردوں نے جواب دیا وہی خاتون جو گوٹہ لچکے کا ڈوپٹہ پہنے تھیں۔
حکیم صاحب فوراً سمجھ گئے کہ یہ ان مریضہ کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جو
اربابِ عیش و نشاط کے طبقہ سے متعلق تھیں۔
شاگردوں کی موجودگی کے پیشِ نظر احتیاطی طور پر جواب دیا اچھا وہ۔ خمیرہ گاؤزبان
سادہ بورق نصرۃ آمیختہ۔
ایسے ہی ایک موقع پر حکیم مومن نے مریض کو اپنے مطب میں دیکھ کر ایک نسخہ
تجویز کر دیا اور عطار خانے سے دوائیں خرید کر استعمال کرنے کو کہا۔ چند یوم کے
بعد وہ مریض حکیم مومن خان کے آبائی مطب میں پھر حاضر ہوا۔ جب اس مریض کا نمبر آیا

توحکیم صاحب نے نسخہ طلب کیا۔مریض نے بڑے تعجب سے کہا کہ۔حکیم صاحب وہ نسخہ تو اُبال کر پی گیا۔ اور دو یوم برابر پیتا رہا ہوں ۔ نصف افاقہ ہوگیا ہے۔ وہی نسخہ پھر دیدیجئے۔تاکہ دو یوم اور پی لوں جو نصف مرض رہ گیا ہے تاکہ وہ بھی ختم ہو جائے۔ حکیم صاحب نے مریض کی فرمائش کی تکمیل کی اور نسخہ لکھ کر دے دیا۔

اس مریض نے دو یوم مزید حسب سابق یہ نسخہ بھی استعمال کیا اور فائدہ ہوگیا۔ شاگردوں کے استفسار پر جواب دیا کہ چونکہ اس کو اعتماد ہو گیا تھا اس لئے ایسا ہی کیا۔ اگر ٹوکتا یا غلط استعمال کرنے پر اس کو ہدایت دیتا تو وہ نصف افاقہ سے محروم رہ جاتا۔

چونکہ حکیم مومن خان مومن عملیات نیز تعویز دینے کے لئے مشہور تھے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اسی عمل کے دباؤ میں ہوا ہو۔

حکیم محمود خاں دہلوی

۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۶ء ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۹۰۰ء

حاذق طبیب اور ماہر جنسیات

مسیح الملک حافظ اجمل خان کے والد گرامی حکیم محمود خان طب کی اُن مایۂ ناز گرامیٔ قدر ہستیوں میں ہیں جنھوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں غربا، مساکین و مظلوموں کا بھرپور ساتھ دیا اور اس پاداش میں جیل کی تنگ و تاریک سنگلاخ مقام پر بند بھی رہے۔

قومی یک جہتی اور چھوا چھوت کے خلاف حکیم محمود خان نے اس وقت تحریک چلائی جب اس جذبے کا وجود نہ تھا۔

دہلی کی تاریخ بھی ایک عجیب تاریخ ہے اس کی تاریخ بے شمار انقلابات خوں چکاں واقعات۔ ناگہانی آفات اور ہر طرح کے خون آشام حادثات سے پُر ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جس نے اتنے مصائب دیکھے ہوں۔ زمانہ اور رفتارِ زمانہ کے مطابق سرد و گرم سہا ہو۔ یہ دلّی اور صرف دلّی ہی کی قسمت ہے۔ کہ اس نے یہ تمام انقلابات خود دیکھے ہیں۔

خاندان :-

حکیم شریف خان کے وارثِ طب حکیم صادق خاں کے تین فرزند تھے (۱) حکیم غلام محمد خان (۲) حکیم غلام محمود خان (۳) حکیم غلام مرتضیٰ خان۔ اوّل حکیم غلام محمد خان اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں ۴۴ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے تھے۔ اور آخری صاحبزادے حکیم غلام مرتضیٰ نے ۱۲۹۲ھ بعمر ۴۵ سال میں مالک حقیقی سے جاملے۔

درزند و موج فتن در رسید۔ یعنی جناب ممدوح ودیعت حیات بجان
آفرین سپردند و عہدہ طبابت نامزد خاندانی بنام این گمنام مقرر گشت
از آنکہ جناب بھائی صاحب قبلہ حکیم غلام محمد خان صاحب در حیات
جناب ممدوح رحلت فرمائے عالم بقا بودہ باشند و برادر دیگر ایشان ہم حکیم
غلام مرتضٰی خان بوجہ ملازمت سرکار پٹیالہ قیام داشت۔۔۔۔۔

قومی و ملی کارنامے:۔

دہلی کے پرآشوب دور میں جب کہ چہار جانب بدامنی، خون خرابہ تھا۔ علم و ادب، علوم و فنون کا نہ کوئی مرکز تھا اور نہ ہی گہوارہ۔ ایسے حالات میں دیگر خاندانوں اور اہل علم و فضل کے ساتھ خاندان شریفی کے افراد کئی دیسی ریاستوں سے وابستہ ہونے لگے تھے۔ اور دہلی کے دیگر خاندانوں کے ساتھ ساتھ خاندان شریفی کے بھی بیشتر افراد و ارباب علم و فن و ہنر لکھنؤ، رام پور، پٹنہ، کلکتہ، حیدرآباد میں منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایسے حالات میں دیسی ریاستوں کے قدردان حکمران ریاستوں نے عہد مغلیہ کے ان جواہر پاروں اور جواہر ریزوں کو جہاں پایا [illegible] لیا۔

حالات کی نزاکت اور دہلی کے منتشر ہو کر بار بار لٹنے اجڑنے سے تنگ آ کر حکیم محمود خان کے برادر کلاں حکیم غلام محمد خان پانچسو روپیہ ماہوار وظیفہ پر ریاست پٹیالہ کے وہاں منسلک ہو گئے تھے۔ اور وہیں رہنے لگے تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے صاحبزادے غلام اللہ خان بعد میں جن کی دختر سے حاذق الملک [illegible] خان کی شادی ہوئی تھی اور چھوٹے بھائی حکیم مرتضٰی خان بھی [illegible] سے منسلک رہے۔ خود حکیم محمود خان ریاست جھجر کے [illegible] کے معالج خصوصی تھے۔ اور ریاست جھجر سے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔

حکیم غلام محمد جو اُن کے نہ صرف بڑے بھائی ہی تھے بلکہ محسن اور مربی بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ استاد طب بھی۔ حکیم غلام محمد نے حکیم محمود خان کا غدر ۱۸۵۷ء میں بہت ساتھ دیا اور ان حکیم غلام محمد کے خاندانی اثرات نے خاندان شریفی کو

ان کی پوری عزت کی گئی۔ مرزا غالب جو حکیم محمود خان کے پڑوسی تھے اور قریب ہی کے مکان میں مقیم تھے انھوں نے اپنی تصنیف دستنبو میں نقل کیا ہے۔

۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ شہر پھر واپس آنے لگے۔ اسی اثناء میں حاکم شہر کو چغلی خوروں نے خبر دی کہ راجہ نریندر بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خان کا مکان مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں۔ چنانچہ ۱۰ فروری سہ شنبہ کے روز حاکم شہر دوڑ کر آ گیا اور مالک خانہ کو مع ساٹھ آدمیوں کے پکڑ کر لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات ہی رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خان کو واپسی کی اجازت ہوئی ۱۲ فروری کو کچھ اور لوگ چھوڑ دیئے گئے۔ ۱۳ فروری کو تین اور نے رہائی پائی۔۔۔۔۔

اس واقعہ کا ذکر غلام رسول مہر نے جو غالب کے ہمعصر اور شفیق دوست تھے اپنی کتاب غالب میں بھی کیا ہے مگر ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

چونکہ حکومت وقت کو کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا اس لیے اور خاندانی اثرات اور ذاتی شخصیت ایسے موقع پر کام آئی ورنہ اگر ثبوت بغاوت مل جاتا تو دوسری زندہ بچنا محال ہو جاتا بلکہ شریف منزل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی۔

اس پر آشوب دور میں شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خان تھے جن پر انگریزوں کی جاسوسی اور بہادر شاہ ظفر کی تباہی کا الزام تھا ان کی جانب سے عوام کی [illegible] بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسری جانب خاندان شریفی کی خدمات اور حکیم محمود خان کی زمانہ غدر میں باشندگان دہلی کے ساتھ ہمدردیاں ان کی [illegible] کی عوامی مقبولیت اور حذاقت و لیاقت کی بنا پر حکیم محمود خان اعظم کا مطب بہت کامیاب ہو گیا۔

حکیم محمود خان کو خدا نے حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں سے نوازا تھا۔ نورانی خون سے ان کا چہرہ روشن تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی مردانہ وجاہت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ لانبا قد، متناسب اعضا، جسم کی رنگت سرخ و سفید

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا — تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور بے نوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا — کوئی مفلس کا نہ تھا پرسان حال اسکے سوا

کرتے ہیں جو دعویٰ ہمدردیٔ نوعِ بشر
اس نے باطل کر دیئے تھے انکے دعوے سربسر

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں کو خاص و عام سب — پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا جو ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب — اس کے بیماروں کو گویا یہی ہوں یا جان طلب

سوءِ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم محمود خان عوامی طور پر کتنے مقبول اور معروف تھے۔ شاعر کی آواز قوم کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس سے جہاں حکیم صاحب کی قبولیت عزت اور شہرت کا پتہ لگتا ہے وہیں ارباب علم و فن و شعر کا حکیم محمود خاں سے قربت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

پسماندگان :-

حکیم محمود خان نے اپنے بعد پانچ اولادیں چھوڑی تھیں ۲ دختران اور ۳ فرزند جو ان کی علمی ادبی فنی امانتوں کے حقیقی وارث ثابت ہوئے اور انھوں نے اپنے باپ کے نام کو مزید چمکایا۔ سب سے بڑے حکیم عبدالمجید خان۔ منجھلے حکیم واصل خان اور سب سے چھوٹے حکیم اجمل خان۔

سب سے بڑی وراثت جو حکیم محمود خاں نے اپنی اولاد کے لئے چھوڑی وہ دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک اخلاق انسانی اور جذبۂ خدمت خلق، دوسرے اپنے فن کی محبت۔ دنیا کے مال و متاع سے انھوں نے بہت کم حصہ پایا تھا۔

طبی معرکے :-

حکیم محمود خان کے مطب میں مرضاء کی لائن لگتی تھی اور ہر مریض باری سے بیٹھ جاتا تھا۔ جب اس کا نمبر آتا تو دیکھا جاتا تھا۔ امیر غریب کی تفریق نہ تھی۔ ہاں اگر کوئی بہت

پلایا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ مرگئی تو میں قیامت کے دن آپ کا دامن پکڑوں گا۔
حکیم صاحب نے فرمایا۔ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ تو مجھے خواہ مخواہ دھوپ میں دِق کرنا چاہتا ہے اچھا چل۔ یہ کہہ کر آپ پاپیادہ ساتھ ہولئے۔ گھر پر آتے ہی ایک لوہے کی نالی سے منہ کھول کر شربتِ عناب پلوایا اور شربت کے پیتے ہی مریض کو آرام ہوگیا۔

کے مشہور شہر بنارس میں ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں تولد ہوئے۔

تعلیم و تربیت :-

حسب قاعدہ تعلیم کی ابتدا گھر کے بزرگوں سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے کتب درسیہ فارسیہ کی تعلیم کے لئے مولوی ثناء اللہ کے سامنے حاضر ہوئے اور عربی زبان کی تعلیم کے لئے مولوی عبد الحق جیسے استاد فن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ مولوی عبد الحق اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب حکیم شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی جیسے عالم باعمل کے طبیب وقت کے شاگرد رشید تھے۔ آپ کے زمانہ میں عربی طرز تعلیم دینیات پر مبنی تھا۔ کتب حکمت یعنی علوم عقلی بہت کم پڑھائے جاتے تھے۔ آپ نے ملا نظام الدین صاحب کا سلسلہ نظامیہ مولوی قطب الدین صاحب سے پڑھا جو شارح مسلم کے پوتے تھے۔ اس کے بعد آپ کو مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیجا گیا جہاں آپ نے مولوی عبد الحق فرنگی محلی سے درس حاصل کیا اور علوم میں فاضل ہوئے۔

تعلیم طب :-

مولوی عبد الحق فرنگی محلی سے درسیات کی تکمیل کر کے آپ نے اپنے خاندانی پیشہ طبابت کی جانب رجوع کیا۔ اور کتب درسیہ طب مشہور و معروف طبیب حاذق لکھنؤ حکیم محمد علی لکھنوی سے حاصل کی۔ حکیم ابو علی صاحب نے حکیم محمد علی کے مطب میں مسلسل دس برس تک رہ کر علم طب میں استفادہ کیا۔ حکیم محمد علی جیسے صاحب فن و طبیب کامل نے آپ کو اسرار طب سے بخوبی اس طویل وقفہ میں واقف کرایا۔ اور حکیم محمد علی سے سند طبابت حاصل کر کے اپنے آبائی وطن ثانی بنارس کے مشہور و معروف محلہ دال منڈی میں اپنے اجداد کے دواخانے میں مطب شروع کیا۔

محلہ دال منڈی بنارس میں آپ کا مطب "جعفریہ دواخانہ" کے نام سے مشہور تھا۔ تقریباً پچاس سال تک بڑے کروفر سے مطب کیا۔ اسی زمانے میں آپ کا شہرہ

بحیثیت معالج خاص مہاراجہ بنارس کے ہوا۔ اس عہد قدیم میں مہاراجہ بنارس سے بطور معالج ۳۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔

اکثر رجواڑوں اور تعلقہ داروں میں معرکۃ الآرا علاج و معالجہ کرتے اور آپ کی خلعت و انعام سے عزت افزائی کی جاتی اسی طرح آپ کی شہرت دیار بدیار بڑھتی چلی گئی۔ خاص طور پر صوبہ بہار کے مہاراج کی رانی صاحبہ کے جنون کا علاج اور تعلقہ داروں میں راجہ صاحب ... پور کے یہاں کینسر کا علاج اعلان سلطان قابل ذکر ہیں بلحاظ امتیاز ہے اور جو غایت شہرت کا باعث ہے۔

دور دور سے مختلف امراض میں مبتلا مریض آیا کرتے تھے اور خدا کے فضل سے شفایاب ہو جایا کرتے تھے۔ خدا نے آپ کو دست شفا بھی عنایت فرمائی تھی۔ مٹی بھی ہاتھ میں اٹھا کر دے دیتے تو مریض شفایاب ہو جاتا۔ چنانچہ بنارس میں ان کے ایک علاج کی بڑی شہرت ہوئی کہ یہ حیرت انگیز علاج آج بھی زبان زد عام ہے۔

شعری و ادبی ذوق:-

حکیم محمد جعفر صاحب صرف میدان طب و حکمت کے ہی شہسوار نہیں تھے بلکہ شعر و ادب کے بے تاج تاجدار تھے۔ انھوں نے جہاں حکمت کے باب میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہیں شعر و ادب میں بھی خواص کا ذہن حاصل کیا ہے۔

مولانا سید ظفر الحسن صاحب ان کی اس صفت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"آپ کی طبیعت فن شعر و ادب میں نہایت موزوں تھی۔ آپ جناب حکیم محمد علی حزیں لکھنوی کے شاگرد تھے اور حزیں مرحوم میر انیس جیسے باکمال شاعر کے شاگرد تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:-

حزیں کیونکر نہ غم ہو دل پہ اس استاد کامل کا
کہ تھا یکتا انیس خوش بیاں صاحب کمالوں میں

اس طرح بیک واسطہ میر انیس کے شاگرد تھے۔

تبرکاً صرف چند قطعات ایک غزل اور ایک قصیدے کے کچھ اشعار بطور نمونۂ کلام پیش ہے۔

"قطعات نوروزی"

حمد خدا کہ فصل مسرت نشاں رسید — یاد بہار عطر فشاں در جہاں رسید

خندد چرا نہ غنچہ دلہائے مومنین — امروز حق ز فضل خدا بر مکاں رسید

دیگر

امروز چشم حق رضا مستقر شد — محکم بنائے دین خدائے مجید شد

جعفر چرا نہ بازوئے ایماں قوی شود — پشت و پناہ او چو شہ دستگیر شد

غزل

نشانم را نہ بود آنجا نشاں جائیکہ من بودم
ہمہ راز نہاں بودہ عیاں جائیکہ من بودم

بیک خردل نمی گیرند اسباب مسرت را
متاع درد باشد بس گراں جائیکہ من بودم

زخود با سر بکف آیند عشاق اندراں مقتل
نہ جلاد است نہ تیغ و سناں جائیکہ من بودم

مثال دردلہا از صفا آئینہ می گیرد
نباشد حاجت آہ و فغاں جائیکہ من بودم

ز تسلیم جنون و بے خودی کارش بکار آمد
نباشد کار عقل نکتہ داں جائیکہ من بودم

حجابات خودی بودہ ز نور بے خودی مائل
فنا گشتہ رسیدم در جہاں جائیکہ من بودم

بیا زارش نہ آرز خبر بعشق مصطفیٰ جعفر
گراں قدرست ایں گوہراں جائیکہ من بودم

* * *

قصیدہ

اے کہ ذاتت مورد من عندہٗ ام الکتاب
وے کمالت مصدر من ادنیٰ فصل الخطاب

قاسم تسنیم و کوثر ساقی خم غدیر
رافع درجات جنت شافع یوم الحساب

مطلع مہر امامت منبع انہار فیض
موضع علم لدنی مجمع امّ الکتاب

پردہٗ عصمت سرایت چادر تطہیر گشت
بارگاہت را خدائے عرش کردہ مستطاب

بارک اللہ رتبہ راہ نجف گردون وقار
بیں کہ از گلگشت فزون کہکشان آب و تاب

چوں نہ باشد سرمۂ چشم بصیرت آن غبار
صبحدم روید زجاروب شعاعی آفتاب

از علی علم نبوت را اگر خواہی بخواہ
بتوان داخل شدن در شہر گرامی زباب

گر شود از فیض دریائے عطایت آبگیر
گوہر شہوار بارد جائے باران از سحاب

چوں نہ باشد حق تو روشن تر از مہر منیر
شاہد حق تو گشتہ وقت رجعت آفتاب

از تجلائے جمالت عشق شد آمد بہ ہوش
چوں گل رخسار تو باشید بر موسیٰ گلاب

نعمت جاوید بر خوان علی یغما دہند
حصہ از باغ رضواں گر تو میخواہی شتاب

دشمنت را ز طواف کعبہ و سنگش چہ سود
بے تولائے تو بہ گردد چوں عمل نقش بر آب

مطلب جعفر برآید گر بخت گردد مقام
ہشت نماکش چوں شود خاک حریم بوتراب

آپ کے اوصاف حمیدہ اور صفات پسندیدہ کے تذکرے بڑے بوڑھوں کی زبان پر اب بھی جاری ہیں۔ مریضوں میں طبیب مہرباں۔ دین داروں میں واعظ خوش بیاں۔ احباب میں تواضع کی جان غرضیکہ وہ ہمہ رخ انسان تھے۔ آپ نے چند رسائل بھی لکھے ہیں جن میں سے علم کلام میں دو رسالے "الہام ربانی" "ارشاد المفید الہدایۃ الرشید" چھپ چکے ہیں۔

وفات:-

آپ کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو ہوا اور روضہ فاطمان میں علامہ شیخ علی حزیں اعلی اللہ مقامہ کے مزار کے متصل آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

آپ کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شہر بنارس کی میونسپل کارپوریشن نے اس سڑک سے جو راستہ دال منڈی کے لئے کٹتا ہے اور جو دلمہ گلی ناٹی امام لوہن کلاں ریشم کٹرہ پیادہ مہال اور دال منڈی ہوتی ہوئی چوک تک چلی جاتی ہے وہ آپ کے نام سے بطور یادگار منسوب کر دی گئی ہے۔ حکیم محمد جعفر روڈ کی ابتدا اسی سڑک سے ہوتی ہے جہاں کارپوریشن کی طرف سے اس نام کا بورڈ نصب ہے اور یہ آج سے پانچ سال قبل کا واقعہ ہے۔ اسی روڈ کے درمیان میں حکیم محمد جعفر اعلی اللہ مقامہ کا رہائشی مکان واقع ہے۔

شاگرد و پسماندگان:-

آپ کے کئی شاگرد تھے جن میں اکثر صاحب مطب ہوئے۔ حکیم عبدالرحمن خان اور حکیم [illegible] حسین نے کافی شہرت حاصل کی۔

حکیم ابو علی محمد جعفر کے تین لڑکے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے حکیم ابوالحسن محمد باقر صاحب جو ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ ہی مطب کرتے تھے۔ حکیم محمد جعفر کے انتقال کے بعد ۱۹۲۲ء سے خود مطب چلا رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے پسماندگان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ ان کے صاحبزادے جن کا نام محمد اطہر ہے، وہ آج بھی کلکتہ میں اپنا مطب کر رہے ہیں وہ حکیموں میں مشہور و معروف شخصیت کے حامل بھی ہیں۔

حکیم محمد جعفر صاحب کے دوسرے صاحبزادے حکیم ابوالقاسم محمد طاہر جھریہ صوبہ بہار میں اپنا مطب کرتے تھے پچاس سال سے زائد مطب کرنے کے بعد عمر پچھتر سال انتقال کیا۔ چونکہ لاولد تھے اس لئے مطب کا سلسلہ بند ہو گیا آپ کا مطب اور تین قطعہ پختہ مکانات موجود ہیں وقف فی سبیل اللہ ہیں۔

حکیم محمد جعفر صاحب کے تیسرے صاحبزادے حکیم محمد کاظم نے اپنے والد بزرگوار کے مطب کو بہت ہی حسن و خوبی کے ساتھ چلا رہے تھے اور قابل قدر ترقی کی تھی۔ فنِ طبابت و حکمت میں آپ نے دورِ حاضرہ میں بہت ہی قابلِ قدر خدمتیں انجام دی تھیں۔ جسے یوپی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی بہت سراہا گیا۔

ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

1۔ خیراتی یونانی اسپتال قائم کیا۔ جو ابھی تک قائم ہے۔
2۔ آنکھوں کے آپریشن کا اسپتال کھولا جو ابھی تک جاری ہے۔
3۔ بنارس میں ایک طبیہ کالج سلفیہ طبیہ کالج کے نام سے جاری کیا تھا۔
4۔ بورڈ آف انڈین میڈیسن کے ممبر ہوئے۔
5۔ بورڈ آف میڈیسن کے وائس چیئرمین ہوئے۔
6۔ فروری ۱۹۶۱ء میں الہ آباد میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کرائی۔

مندرجہ بالا کارہائے نمایاں نے ان کی عزت و عظمت کو [illegible]

حکیم محمد جعفر کو قدرت نے عزت و دولت اور [illegible] اولاد کی نعمت بھی عطا کی تھی۔ آج ان کی نواسہ ان کی اولادیں امریکہ، مغربی جرمنی، سعودی عربیہ، کویت اور پاکستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔

موصوف کا عزاخانہ جعفریہ آپ کی رہائش گاہ پر قائم ہے۔ [illegible] مسجد بھی درگاہ فاطمان میں تعمیر کرائی۔ جہاں ایک تختی پر نام [illegible] کندہ ہے۔

آں محمد جعفر عینین نفس | بانیٔ مسجد شہر از لطف کرم
مصرعہ تاریخ ما بی حسب حال | حکمت میکدہ است ایں فعل از حکیم

ایک وقف بھی قائم کیا تاکہ عشرۂ محرم میں مجالس اور رمضان المبارک میں افطار وغیرہ کا اہتمام بغیر کسی دقت کے کیا جا سکے۔ اس کے لئے آج سے ستہ سال قبل تیس ہزار روپیہ اس وقف کے لئے بینک میں محفوظ کر دیا تھا جو بڑھتے بڑھتے بفضلِ خدا پچاس ہزار روپیہ ہو چکے ہیں۔

معرکے :-

بنارس کی ایک مشہور و معروف شخصیت کی نکسیر پھوٹی اور انتہا سے زیادہ خون جا رہا تھا کسی حال بند نہ ہوتا تھا۔ حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ صبح کے وقت لوگ آپ کے پاس آئے۔ آپ منہ دھو رہے تھے اور لوگ نکسیر کے مریض کی دوا کے لئے عجلت کر رہے تھے۔ آپ نے انھیں اپنے منجن سے دو چٹکی راکھ دے دی اور کہا کہ ناک میں کسی صورت سے ڈال دیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ خون بند ہو گیا اور وہ اس صورت سے شفا پا گئے۔ اور پھر کبھی یہ شکایت انھیں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ شاگردانِ رشید کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ منجن میں حابشات (خون بند کرنے والی دوائیں) خاصی تعداد اور مقدار میں تھیں۔

آپ کی حذاقت کا چرچا بنگال، بہار اور مشرقی یوپی میں بیحد تھا۔

۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء حکیم حاجی محمد عبدالعزیز ۱۹۱۱ء

تاج الاطباء   بانی ادارہ طب   فخر الاطباء

سرزمین ہند میں تاریخ طب یونانی کے باب میں فن کو بچانے سنوارنے اور آبیاری کرنے میں جہاں چیدہ چیدہ اطباء کا کردار نمایاں رہا ہے وہاں چند خاندان ایسے بھی گزرے ہیں جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت طب یونانی ہندی طب کے ساتھ مل کر آج موجودہ شکل میں موجود ہے جب کہ طب یونانی کی جائے پیدائش یونان تک میں اس طب قدیم کا وجود نہیں ملتا ہے۔

حکیم محمد یعقوب کے خاندان میں ویسے تو لاتعداد قابل اور حاذق اطباء ہوئے ہیں۔ لیکن جو ملکہ حکیم محمد عبدالعزیز کو ملا وہ کسی دوسرے طبیب کے حصے میں نہیں آیا۔ بقول علامہ اقبال بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ حکیم عبدالعزیز کے کارناموں کی بنا پر ان کو وہ عزت و شہرت ملی کہ ان کا خاندان۔ خاندان لکھنؤ کی بجائے بدل کر خاندان عزیزی کے نام سے منسوب ہوا۔

خاندان :۔

خاندان عزیزی کے اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے کشمیر پر جب احمد شاہ درانی نے جبر و اختیار کے بعد تباہی مچائی تو بہت سے خاندان اپنا وطن کشمیر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان پناہ گزیں خاندانوں میں حکیم عبدالعزیز کا خاندان

حکیم مولوی حاجی محمد عبدالعزیز صاحب بانی مدرسہ طب ورئیس لکھنوی

بھی تھا۔ لیکن خاندانِ عزیزی کے بانیٔ حقیقی حکیم محمد یعقوب ہیں۔ جن کی پیدائش لکھنؤ میں ۱۷۹۰ء بعہد نواب آصف الدولہ ہوئی تھی۔

پیدائش :-

محمد عبدالعزیز کی پیدائش یکم محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۸۵۵ء کو لکھنؤ کے ایک علمی ادبی نیز طبی خانوادے میں ہوئی ان کے والد خاندانِ عزیزی کے بانی حکیم محمد یعقوب کے فرزند حکیم محمد اسمٰعیل تھے۔

تعلیم و تربیت :-

تعلیم کی ابتدا حسبِ دستور پانچ برس کی عمر میں والد اور دادا کی پرخلوص دعاؤں کے ساتھ گھر سے شروع ہوئی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق شروع ہی سے ذہانت و ذکاوت نمایاں تھی۔ ابتدائی درسی کتابوں کی تعلیم کے بعد فرنگی محل کے متعدد علماء و فضلا کے ساتھ ساتھ مشہور عالم شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور فارسی و عربی کی تعلیم کی تکمیل کی۔

تعلیم طب :-

سب سے پہلے ان کے دادا حکیم محمد یعقوب نے قانونچہ پڑھایا بعد ازاں طب کی بقیہ کتابیں اپنے چچا حکیم محمد ابراہیم سے پڑھیں۔

۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں ان کے والد محترم نے ان کے مطب کے لئے ایک خوب صورت عمارت تعمیر کرائی جہاں پر حکیم محمد عبدالعزیز دواخانہ کرسکیں۔ آج یہ عمارت تکمیل الطب طبیہ کالج کے نام سے جانی جاتی ہے۔ عمارت پر حسبِ ذیل اشعار تحریر تھے۔

مسیحائے ثانی ہیں عبدالعزیز اب	مطب کے لئے ان کے یہ گھر بنا ہے
لکھی کلک الفت نے تاریخ ہجری	یہ دارالشفاء ہے یہ دارالشفا ہے

بچپن سے ہی علمی ادبی نیز طبی شوق حد درجہ تھا درس و تدریس کے شوق و رغبت

اور اپنے امراض کا علاج حکیم عبدالعزیز سے شروع کیا جب مولانا کو علاج سے افاقہ ہوگیا تو مولانا نے ایک دن حکیم صاحب سے کہا میں نے آپ کے درس کی بہت تعریف سنی ہے کسی وقت خود بھی شرکت کی خواہش ہے حکیم صاحب نے جواب دیا آپ جب چاہیں تشریف لائیں لیکن علماء کے سامنے میرا درس کیا حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ سے روانگی سے ایک یوم قبل بغیر اطلاع کے مولانا درس میں خاموشی سے شریک ہوگئے اور کافی دیر تک سنتے رہے درس کے بعد فرمایا حکیم صاحب جیسا میں نے سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر آپ کو پایا۔ میں نے دہلی میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کا درس بھی سنا ہے۔ لیکن آپ کے درس کا عالم ہی جداگانہ ہے۔ یہ طب اور فلسفے کا گنجینہ ہے۔

اسی طرح ایک دیگر بزرگ مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی اپنے وقت کے مایہ ناز عالم تھے۔ لکھنؤ کے قیام میں اکثر حکیم صاحب کا درس سننے تشریف لاتے تھے ان کا کہنا تھا کہ حکیم صاحب حکمت و فلسفے کے بحر ذخار ہیں۔ مشہور عالم اور اپنے وقت کے مایہ ناز جید فاضل مولانا عبدالحق خیرآبادی جن کے شاگرد رشید متعدد اہل کمال اطبّا ہوئے ہیں۔ لکھنؤ تشریف لائے اور حکیم عبدالعزیز کے درس میں شرکت کی۔ درس سننے کے بعد فرمایا۔ آپ کتابوں کی مشکلات اس طرز سے بیان کرتے حل کردیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معقولات میں آپ کا علم کس قدر وسیع ہے۔ میں کسی اہل علم کی تصنع کے ساتھ تعریف نہیں کرتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت ہندوستان میں فخر الحکماء اور تاج الاطباء ہیں آپ کا نظیر آئندہ یہاں مشکل سے ہوگا۔

لکھنؤ اور ہندوستان میں خاندان جھوائی ٹولہ کو جو مرکزی اہمیت حاصل [illegible] وہ صرف علاج و معالجہ میں مقام خصوصی کی اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ [illegible] یہ ہے کہ اس خاندان نے اپنے وقت میں طب کی تعلیم کے لیے جدید [illegible] کیا بلکہ اس کے لیے عملی جد و جہد بھی کی۔

ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں اگر خاندان شریفی کے مایہ ناز طبیب حکیم عبدالمجید کے ہاتھوں مدرسہ طبیہ کا قیام عمل میں آیا تھا جو دہلی کے طریقہ علاج کا نمائندہ کالج تھا تو حکیم محمد یعقوب بانیٔ خاندان عزیزی کے سردل عزیز طبیب حکیم محمد عبدالعزیز کے ہاتھوں لکھنؤ کے طریقہ علاج کی ترقی و سربلندی کے لئے

جانب متوجہ کرتا تھا۔
مجھ کو بھی بعض بڑی بیماریوں میں لائق ڈاکٹروں کی شرکت یا مشورت کرنے سے اور اپنے خاص زیر علاج بیماروں میں اعمال بالید کی ضرورت داعی ہونے سے بارہا کرات و مرات ایک ایسی کمی محسوس ہوئی جس سے غیرت و حمیت فن نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اس نقصان کی تلافی کروں اور اس فن شریف کو جیسا ہوتا آیا ہے اس کی حالت اصلی کی طرف پلٹا دینے کی کوشش کروں۔ تب میں نے اپنے دونوں بڑے صاحبزادوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کو لفٹیننٹ کرنل سے انڈرسن سول سرجن کی خدمت میں بھیج کر تشریح و سرجری کی تعلیم دلائی۔ ایک دو طبیب [illegible] بالید پورے ملک کی ضرورت کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ ہی طب یونانی کے ناقص المعیار ہونے کا الزام رفع کر سکتے تھے اور نہ ہی اطبائے یونانی کے پورے گروہ سے بے کمالی کا داغ مٹا سکتے تھے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے پاس حاضر باش شاگرد پیشہ اطبا کو بھی عمل بالید کی تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر طب کا نام روشن کریں اور [illegible] پرورش پائی ہے طب [illegible] کا نشانہ نہ بنے۔“

حکیم عبدالعزیز کے پاس اپنے آبائی اجداد کا ایک قدیم نادر کتب کا نجی کتب خانہ بھی تھا۔ جو آگے چل کر انھوں نے اپنی درسگاہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔
حکیم عبدالعزیز چند سالوں سے برابر غور کر رہے تھے کہ جھوائی ٹولہ کی طبی مرکزیت اور تدریسی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر باقاعدہ ایک طبی درسگاہ قائم [illegible] کام تن تنہا انجام نہیں دیا جا سکتا تھا اس لئے خاص احباب سے مشورہ [illegible] ۱۹۰۲ء کو ایک جلسہ شوریٰ منعقد کیا جس میں عمومی تعاون [illegible] فراہمی آلات جراحیہ کی خریداری۔ مریضاں کے لئے جگہ کا انتظام۔ غیر مستطیع طلبا کے لئے بے فکر ہو کر عمل بالید کی مشق کرانے کا انتظام کرنے پر اتفاق ہوا۔ لیکن اسی وقفہ میں انھوں نے اپنے پیر و مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ "عبدالعزیز مدرسہ قائم کر دو اور میری جانب سے [illegible] جو ایک اشرفی پر مشتمل تھا اس میں شامل کر دو۔ آنکھ کھلتے ہی انھوں نے اپنے

برادرِ خورد حکیم عبدالحفیظ دونوں صاحبزادوں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالحمید اور دو برادر زادوں حکیم حافظ عبدالمجید اور حکیم عبدالمعید کو جمع کیا اور خواب کے تذکرے کے بعد فرمایا کہ اب میں اپنے طبی درسگاہ کے قیام کے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا ہوں اس کے بعد مذکورہ جلسہ احباب بلایا تھا۔ جن میں ان کے ساتھ احباب و رفیق شریک ہوئے تھے۔

اس مشورہ سے قبل حکیم عبدالعزیز متعدد بار اس طرح کے بیانات جاری کر چکے تھے جن میں طب میں علم تشریح۔ علم جراحت اور علم الادویہ کی ناقص تعلیم کو طب کی کسمپرسی کا سبب سمجھ کر اس کی اصلاح کے لئے فکرمندی کا اظہار کر چکے تھے یہی احساس "تکمیل الطب" کے قیام کا مقصد بن گیا۔ جس کے تحت جولائی ۱۹۰۲ء میں حکیم عبدالمجید دہلوی کی طرح انھوں نے بھی ہمت کرکے ایک طبی درسگاہ "تکمیل الطب" کی بنیاد ڈالی اور تین سال کا نصاب تعلیم مقرر کیا۔ جس میں طبِ نظری کے ساتھ عملی تربیت کو اہمیت دی گئی ہے۔ مدرسہ میں معیارِ تعلیم کو یقینی بنانے کے لئے بیرونی ممتحن مقرر کئے گئے۔ حکیم عبدالعزیز نے کلیات قانون کا درس دینے کی ذمہ داری خود لی۔ حمیاتِ قانون حکیم عبدالحفیظ کے سپرد ہوئی۔ شرح اسباب اول حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالمجید کے ذمہ ثانی۔ نفیسی کامل الصناعۃ تشریح و جراحت حکیم عبدالحمید کے ذمہ سپرد کیا گیا۔ قانونچہ موجز اقرائی حکیم عبدالمعید کو پڑھانے کے لئے دیا گیا تعلیم قدیم رواج کے مطابق سبقاً سبقاً ہوتی تھی۔ کتب درسیہ طلبہ کی واجبی پر خصوصی توجہ دی گئی اور حکیم عبدالعزیز کے رفیق خاص منشی پراگ نرائن مطبع نولکشور نے کتب درسیہ کی طباعت کا خاص اہتمام کیا۔ اور مطبع نامی نے بھی طب کی کتب طبع کیں جن میں زہراوی کی کتاب التصریف اسرجری کا خاص اہتمام سے شائع کی۔

۱۹۰۲ء میں ملک میں طاعون کی وبا پھیلی جس کے اثرات سے لکھنؤ بھی محفوظ نہ رہا۔ اس موقع پر یونانی اطباء کی حذاقت اور مسیحائی نے بڑا کام کیا۔ مدرسہ طب "تکمیل الطب" میں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالمجید کے زیر نگرانی جدید شاخ عمل بالید کی کھل جانے سے طبی علاج کے سوا طاعونی گلٹیوں کے چاک کرنے میں بہت مدد ملی۔

تکمیل الطب کے سالانہ ایک جلسے کے موقع پر جبکہ عمائدین ملک موجود تھے مرزا محمد
عباس ہوش لکھنوی نے ایک قصیدہ پیش کیا جس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں۔

مگر اس گم شدہ دولت کو جس نے پھر نکالا ہے　　وہ ہے حکمت کا پتلا اور مجسم عقل یونانی
وہی ہے سرور آورد زمانے کے طبیبوں میں　　وہی ہے فخر زہراوی وہی ہے رشک گیلانی

وہ ہے استادِ کامل نام ہے عبدالعزیز اس کا
نہ سمجھ شیخ ثانی بلکہ وہ ہے شیخ لاثانی

لفٹیننٹ کرنل جی انڈرسن سول سرجن لکھنؤ جو تکمیل الطب کالج کے خاص سرپرستوں
میں تھے جن کے ذریعے سے آلات جراحی منگائے گئے تھے اور جن کی مہربانی سے عملی
بالیدہ میں تکمیل الطب کو ترقی ملی۔ ۱۹۰۹ء میں جب وہ ریٹائرڈ ہو کر اپنے ملک کو واپس
ہو رہے تھے ۲۰ اپریل کو ان کے اعزاز رخصتی میں جو تقریب ہوئی اس میں [illegible]
مولانا شبلی، مہاراجہ محمود آباد علی محمد خان اور مہاراجہ [illegible] شہر کے
دیگر رؤسا و عمائدین شہر کے ساتھ حکیم حنیف علی رعب جو حکیم عبدالعزیز کے شاگرد
تھے انھوں نے بطور مدح ایک نظم پڑھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

جلوہ گر اس انجمن میں ہے وہ صاحب احترام
جس کے ہیں رہونِ منت کیا خاص اور کیا عام

جس کے ہیں وصف آشنا پیر و جوان [illegible]
جس کے ہیں مدحت سرا چھوٹے بڑے [illegible]

کون یعنی وہ یگانہ جس وحید عصر کا
آئی ایم۔ ایس ڈاکٹر کرنل جی انڈرسن ہے نام

۱۹۰۵ء میں حکیم حنیف علی رعب نے ۱۴۴ اشعار پر مشتمل [illegible]
جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آج جس کی ذات والا سے طب کو افتخار
کون ہے یعنی حضرت عبدالعزیز نامدار

اس کو بقراط و ارسطو پر نہ کیوں ترجیح دوں
[illegible] قابل ہو نہیں سکتی ہے [illegible]

عہد کا اپنے ہے لقمان اور افلاطون عصر
قرشی اپنے وقت کا اور بوعلی روزگار
زندہ ہوتے آج بطلیموس و جالینوس اگر
اس کے خوان فیض کے ادنیٰ سے ہوتے زلہ خوار
غازہ رخسار ہے میرا وہ باشوکت جواں
نام نامی جس کا ہے عبدالرشید نکتہ داں
اک ذکی الطبع جس کا نام ہے عبدالحمید
نور ہے میرے رخ روشن کا وہ روشن رواں
لکھنؤ ملک اودھ کا شہر ہے میر مقام
اور جھوائی ٹولہ ہے اس شہر میں جائے قیام

ایک دوسرے جلسہ ۱۹۰۶ء میں حکیم حنیف علی رعب نے یہ اشعار پیش کئے تھے:

جھوائی ٹولہ میں جس باغ نے نشو و نما پائی
نہ کیوں ہر غنچہ و گل میں ہو اس کی حکمت آرائی

حکیم عبدالعزیز کو کتب بینی کا ذوق حد درجہ تھا۔ نماز ظہر کے بعد عصر کی نماز تک کتب بینی میں مصروف و مشغول رہتے تھے۔ مطالعہ کے کمرے میں تختوں کے چوکے پر صرف ایک دری بچھی ہوتی تھی اور چہار جانب کتابوں کا ڈھیر رہتا تھا۔ قلمی اور نادر کتب منہ مانگی قیمت پر خریدتے تھے۔ یہ کتب خانہ حکیم صاحب نے "تکمیل الطب" کے لیے وقف کر دیا تھا۔

تصانیف:۔

1۔ رسالہ تحفۂ عزیزی فارسی۔ ادویہ مرکبہ کا مزاج نکالنے اور دوا کی کمیت بڑھنے سے کیفیت میں تبدیلی ۔ تفصیلی بحث۔

2۔ رسالہ فی الطال جزجوھر الدماغ

3۔ حواشی بر قانون شیخ } غیر مطبوعہ۔
4۔ ذاتی تجربات }

پسماندگان :-

حکیم صاحب کی پہلی شادی ۱۹ سال کی عمر میں ۳۱ر دسمبر ۱۸۷۲ء مطابق ۱۰ر ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ بروز سنیچر پھوپھا حکیم حاجی رضا کی صاحبزادی زینب خانم سے ہوئی۔
ان سے شفاء الملک حکیم عبدالرشید شفاء الملک حکیم عبدالحمید کے علاوہ ایک صاحبزادی خدیجہ بیگم تولد ہوئے۔ شادی کے بیس سال بعد زینب خانم داغِ مفارقت دے گئیں۔
دوسرا عقد زینب خانم کی چھوٹی بہن یعنی حکیم عبدالعزیز کی سالی سے ہوا۔ ان سے سے چار صاحبزادے حکیم عبدالحکیم، حکیم عبدالمجید، حکیم عبدالعلیم اور حکیم عبدالعظیم اور اور دو صاحبزادیاں اکبری خانم اور اصغری خانم تولد ہوئے۔

مذہبی شغف :-

حکیم صاحب کو اس وقت کے ماحول اور طریقۂ تعلیم نے بچپن ہی سے مذہب کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔ حکیم صاحب فلسفیانہ ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے جھاڑ پھونک کے قائل نہیں تھے۔
طبیہ کالج کی بنیاد پر مولانا نے خواب میں آکر مدرسہ طب کی بنیاد ڈالنے اور ایک اشرفی سے امداد دینے کی بات کہی تھی اسی طرح اپنی صاحبزادی خدیجہ بیگم کی شادی میں روپیہ کی کمی کی وجہ سے تامل فرما رہے تھے تو مولانا کو خواب میں یہ فرماتے دیکھا کہ تاریخ مقرر کردو روپیہ کا انتظام ہو جائے گا۔
دوسرے ہی دن ریاست بڑودہ سے ایک ہزار یومیہ پر طلبی آئی اور مہارانی کے اصرار پر بیس یوم قیام رہا جس سے شادی کا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اور حکیم عبدالمجید صاحب سے عقد ہو گیا۔ ان خوارق نے حکیم صاحب کو اولیاء اللہ خاصکر مولانا کا معتقد بنا دیا تھا۔ چنانچہ اپنے صاحبزادے حکیم عبدالحمید کی بچپن میں علالت اور علاج سے مایوسی کے بعد اپنے ایک رفیقِ خاص منشی احتشام علی رئیس کاکوری کے مشورے سے مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ بوقتِ طعام حکیم صاحب کو یاد کیا گیا تو تنہا تشریف لے گئے

مولانا نے دریافت کیا صاحبزادے کو کیوں نہیں لائے وہ بھی ہمارے ساتھ کھاتے۔ حکیم صاحب نے معذرت کی کہ اسے یخنی تک ہضم نہیں ہوتی ہے معمول کی غذا تو بہت دنوں سے بند ہے۔ فرمایا سب ہضم ہوگا۔ پھر اپنے پاس بٹھا کر ماش کی کھچڑی اور پوری کچوری رنجیدہ تمام ثقیل اور بادی اشیاء جو طبی نقطۂ نظر سے مُضر تھیں کھلوائیں اور پانی میں اپنی تسبیح ڈبو کر پلوائی۔ اسی روز سے عوارضات میں افاقہ شروع ہو گیا۔

حکیم عبدالعزیز نے ۱۹۱۰ء میں انتقال سے ایک سال قبل حج کا ارادہ فرمایا اور عید کے بعد پہلے جہاز سے روانہ ہو گئے۔ مکہ مکرمہ میں آپ کا بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا اور خود شریف مکہ نے آپ سے ملاقات کی۔ حج اور مدینہ منورہ کی حاضری کے بعد آپ نے دیگر مقامات مقدسہ اور مصر کی مشہور درسگاہ جامع ازہر کو بھی دیکھا۔ واپسی میں بمبئی سے لکھنؤ تک عقیدت مندوں نے جس شاندار اور پرخلوص طریقے سے ان کا خیر مقدم کیا اس سے ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کسی شاعر نے حکیم عبدالعزیز کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل شعر لکھا ہے۔

دامن مقصود مجبوروں کا جس نے بھر دیا
جس نے یونان کے فن مردہ کو زندہ کر دیا

وفات:-

حکیم صاحب کی صحت قابل رشک تھی۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ورزش کر لیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں کمزور ہو چلے تھے کہ فالج کا حملہ ہوا اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے حکیم عبدالحفیظ صاحب کے علاج سے افاقہ ہوا۔ چھڑی کے سہارے چلنے لگے تھے پیشین گوئی کی تھی کہ چار ماہ دس دن پر مرض فالج کا بحران ہوگا۔ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی جمعہ کی شب ۱۹ شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو تقریباً ۵۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

یہ معمولی حادثہ نہ تھا آپ کی وفات پر نہ صرف اندرون ملک بلکہ غیر ممالک میں بھی اظہار رنج و غم کیا گیا۔ اخبارات و رسائل نے اداریے اور متعدد شعراء نے

نبض دیکھی اور کہا کہ آپ کو شروع زندگی میں یہ امراض تھے جن کا خفیف اثر اب بھی ہے اور ایک نسخہ لکھ دیا۔ مہاراج بہت ہوشیار و مدبر تھے۔ انھوں نے مہارانی سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے میرے حالات پہلے ہی بیان کر دیئے تھے حکیم صاحب سے۔؟ مہارانی کے انکار پر مہاراج صاحب سخت متعجب ہوئے۔ اور حکیم صاحب کی خوب ضیافت کی۔ حکیم صاحب قیام بڑودہ میں اس درمیان کسی سے نہ ملے۔ صرف کتب بینی ہی کرتے رہے۔

غرضکہ بڑودہ میں حکیم صاحب نے اٹھارہ یوم قیام کیا۔ اپنے دواخانے کی مصروفیات درس وتدریس دافکار کی بنا پر حکیم صاحب لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ یہ دور وہی تھا جب حکیم صاحب اپنی دختر کے عقد میں اخراجات کے لئے متفکر تھے۔ اس کے قبل مہارانی بڑودہ خود قریب قریب دو ماہ لکھنؤ رہ کر علاج کرا چکی تھیں۔

حکیم عبدالعزیز صاحب کا مطب مرجع خلائق تھا خلفاء ور ؤسا سبھی فیضیاب ہوا کرتے تھے۔ مطب میں کسی مریض سے کسی طرح کی فیس نہ لیتے تھے۔ شہر لکھنؤ میں اگر کوئی مریض اس زمانے میں گھر پر جا کر حکیم صاحب کو دکھانا چاہے تو سولہ روپیہ اور اگر صوبہ میں کسی مقام پر بلانا چاہے تو پانچسو روپیہ اور صوبہ سے باہر ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس تھی۔ ایک بار حکیم عبدالعزیز نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں ان کے علاج کے لئے بھوپال بھی تشریف لے گئے تھے اور تین دن بھوپال میں حکیم صاحب کا قیام رہا تھا۔

ایسے تھے پہلے دور کے حاذق کامل و ماہر فن طبیب۔

صوفی صاحب درویش و نیک اندیش

حکیم سیّد برکات احمد ٹونکی

۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء   ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء

ہندوستانی طب کی ترقی و تعمیر میں ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کا بھی بہت تعاون رہا ہے۔ گرچہ اپنے مفاد کے تحت اس ملک میں جدید طریقۂ علاج یعنی ایلوپیتھی طریقۂ علاج کو فروغ دینے کے لئے انگریزوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ پھر بھی آج جو دیسی طریقۂ علاج رائج ہیں وہ سب نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کی رہین منت ہے۔ ان ریاستوں میں حاذق۔ کامل صاحب فن کامل اطبّاء کا تقرر ہوتا تھا اور ان کی حیثیت معالج خصوصی کی ہوا کرتی تھی۔ آج بھی ریاستوں کے اندر جا بجا جو مفت شفا خانے یا اسپتال و دوا خانے نظر آتے ہیں یہ سب اطبّاء اور ریاستوں کی دین ہیں۔

انھیں ریاستوں میں ایک چھوٹی سی ریاست ٹونک بھی تھی۔ جہاں طبّی علاج و معالجہ بہت مقبول تھا عام و خاص میں۔ اسی ریاست ٹونک میں ایک ماہر فن طبیب حکیم مولانا سیّد برکات احمد ٹونکی نے اپنی ذہانت و فراست اور قابلیت کی بنا پر علاج و معالجہ میں ایک بلند مقام اور مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ آج بھی نہ صرف اس ریاست میں بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے فیض یافتہ موجود ہیں۔

خاندان:۔ حکیم سیّد برکات احمد کے والد محترم حکیم سیّد دائم علی جن کا آبائی وطن

میرنگر ضلع پٹنہ صوبہ بہار تھا۔ آپ کے اجداد ایک عرصہ سے نسل در نسل یہاں مقیم تھے۔ ذوقِ علم میں وطن کو خیرباد کہا اور اُس دور کے اساتذہ علم و فن مولانا احسن گیلانی علامہ فضلِ حق خیرآبادی مولانا عالم علی نگینوی اور حکیم احسن اللہ خان دہلوی جیسے یگانۂ روزگار علماء اور اہلِ فن نے ان کے جوہرِ قابل کو نکھارا اور ان بزرگوں کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی۔ علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد ٹونک میں متوطن ہوگئے۔ نواب ٹونک کے مزاج میں وہ رسوخ حاصل کیا کہ طبیبِ خاص اور دیوان خزانہ مقرر ہوئے۔ روحانی فیوض و برکات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حاصل کیں اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حکیم مولانا میر سید دائم علی نے ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں وفات پائی۔

حکیم برکات احمد کے نانا شیخ ولی محمد صاحب کامل ولی تھے جو حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے رشتہ کے بھتیجے تھے۔

ولادت یا پیدائش :-

ٹونک ہی میں ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کو حکیم سید برکات احمد کی ولادت باسعادت ہوئی آپ نسلاً اہلِ سادات میں ہیں۔

تعلیم و تربیت :-

حسبِ قاعدہ ان کی تعلیم کی ابتداء طبیبِ خاص ان کے والد کے [illegible] شاہی طور طریقہ پر شروع ہوئی۔ پھر اس کے بعد ابتدائی تعلیم ٹونک [illegible] میں ہوئی۔ اور [illegible] درسِ نظامیہ کی متوسط کتابوں کی [illegible] حاصل کی۔ والد محترم کے علاوہ [illegible] اساتذہ فن و علم کے [illegible] کیا ان میں مولانا لطف علی بہاری، مولانا محمد حسن تلمیذ مولانا آزاد [illegible] خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پھر اس کے بعد مزید تکمیل تعلیم کے لئے علامہ عبدالحق خیرآبادی کی درسگاہ

علمی میں داخل ہوتے۔ علامہ کی نگاہِ انتخاب نے حکیم برکات احمد کو چن لیا۔ اور علامہ انھیں تعلیم کے لئے ٹونک سے اپنے ساتھ رام پور لے گئے۔ حکیم برکات احمد نے ایک در پکڑ کر مضبوطی سے پکڑا۔ پندرہ سال وہ علامہ عبدالحق خیرآبادی کی خدمتِ باسعادت میں رہے اور مختلف علوم وفنون مثلاً ادب منطق۔ فلسفہ۔ بدیعات۔ طبیعیات الہٰیات کلام۔ اصول وفقہ۔ تفسیر اصول تفسیر اصولِ حدیث میں علامہ کی شاگردی میں رہ کر حاصل کئے۔ علامہ کو معقولات میں غیر معمولی شغف اور کمال حاصل تھا۔ جنوب ایشیا، ان کے فلسفہ اور منطق کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ علامہ عبدالحق کے شاگردوں میں اس ہونہار شاگرد کے جوہر قابل کی چمک دمک علیحدہ تھی۔ اس لئے علامہ فضل حق خیرآبادی اس ہونہار شاگرد کو بڑی محنت اور شفقت سے تعلیم دیتے تھے۔ علامہ کے زیر اثر حکیم برکات احمد کا ذہن ترقی کرتا گیا۔ انھوں نے علامہ سے وہ تمام کتب پڑھیں جو درسِ نظامیہ میں شامل ہیں۔ اور وہ کتب بھی دیکھیں جو خیرآبادی سلسلہ درس میں داخل ہیں۔ مثلاً ہدایہ سعیدیہ۔ ہدیہ الہدایہ۔ جواہر الفالیہ۔ شرح ہدایتہ۔ الحکمت۔ حواشی خونساری اور قوشجی کے قولات۔ وغیرہ۔

دینی علوم :-

دینی علوم کا ذوق ان کو بھوپال کھینچ کر لے گیا۔ اور قاضی محمد ایوب قاضی القضاۃ کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر علوم دینیہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اور علاج ومعالجہ کا پیشہ بھی اپنائے رہے جس کی تکمیل پہلے ہی کر چکے تھے۔ بھوپال میں اپنے چند نہایت معرکتہ الآرا علاج کئے۔

طبی تعلیم :-

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی سے درس کی تکمیل کے بعد پہلے تو تکمیل طب کے لئے مشاہیر اطبا۔ لکھنؤ جو اپنے وقت کے معروف وذکی اطبا رکھتے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن بوجہ کمال علمی وذہانت طبعی آپ کے کوئی طبیب ان کی تشفی کرسکا۔ بالآخر مجبوراً دہلی کا سفر کیا اور عضد دولہ جناب حکیم غلام نجف خاں برادر خورد

شاگرد و تلمیذ رشید احترام الدولہ جناب حکیم محمد احسن خاں صاحب طبیب خاص وزیر سلطنت شاہ ظفر مرحوم کے پاس خدمت میں حاضر ہوکر طب کی ابتدا کی حکیم محمد احسن خاں حکیم مومن خاں مومنؔ کے قریبی رفقاء و اعزا میں تھے۔

حکیم غلام نجف خاں نے ایسے لائق اور قابل طالب علم کو دیکھ کر اپنی تمام قابلیت سے رموز و اسرار طب کی ان کو تعلیم دی۔ اسی زمانۂ تعلیم میں جناب عضدولہ مرحوم نے اپنے پوتے شفاء الملک عالی جناب حکیم رضی الدین کو آپ کے سپرد واسطے تعلیم کے کیا۔ چنانچہ جب تک آپ دہلی رہے حکیم رضی الدین کو درس دیتے رہے اور دولتِ علم و عمل طب و علوم دیگر سے فراغت کرکے بھوپال کا سفر کیا۔

ان کے والدِ بزرگوار حکیم سید دائم علی جو خود بھی حکیم احسن اللہ خاں عزیز حکیم مومنؔ خاں مومنؔ کے شاگرد تھے اور معالج خاص حضور انور امین الدولہ وزیر الملک عالی جناب نواب حافظ محمد ابراہیم خاں بہادر صولت جنگ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ والئ ریاست ٹونک دام اقبالہم کے وہاں تھے۔

اکتیس سال کی عمر میں حکیم مولوی سید برکات احمد علومِ عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہوکر ٹونک تشریف لاتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے والد ماجد دیوان خزانہ اور منصبِ طبیب خاص سے دست کش ہوچکے تھے۔ والئ ٹونک نے ان کے والد کی طرح ان کی بھی پوری قدر افزائی فرمائی۔ اور انھیں اپنی ریاست کے لئے باعثِ عزت و شہرت سمجھ کر ان کو ان کے بڑے بھائی کی جگہ جو بوجہ پیری استعفاء داخل کرچکے تھے مقرر کرکے طبیبِ خاص کا درجہ و مرتبہ عطا کیا۔ اور حکیم برکات احمد اپنے فرائضِ ملازمت نہایت ہی تندہی سے انجام دینے لگے۔

حکیم برکات احمد نے ۱۳۳۱ھ (۱۳-۱۹۱۲ء) میں حج و زیارت حرمین شریف کی سعادت حاصل کی۔ اور ممالکِ اسلامیہ بشمول مصر۔ شام و فلسطین کے مزاراتِ متبرکہ پر حاضری دے کر وطن واپس ہوئے۔

علمی و ادبی خدمات:۔

حکیم سید برکات احمد صاحب کو درس و تدریس سے فطری مناسبت تھی وہ

کے باوجود سادگی کا یہ عالم کہ ایک روپیہ کے پیسے گننا نہیں جانتے تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن دونوں عظیم تھے۔ ان کی نظر علم و فن کی اشاعت پر تھی۔ فن اور شخصیت کے بھرپور جادو نے ان کو علامہ عبدالحق خیرآبادی کے بعد معقولات کا امام بنا دیا تھا لیکن انھوں نے اپنے دانش کدہ کو شریعت کے جمال سے منور رکھا اور کبھی عقل کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔

نورِ معارفت :۔

حکیم سید برکات احمد کے قلب کو جن بزرگوں کے نورِ بصیرت اور معرفت نے منور کیا اور ان پر تصوف کی راہیں کھولیں وہ رام پور کے ایک صاحب دل بزرگ جن کا تعلق سلسلۂ صابریہ سے تھا۔ شاہ رکن عالم تھے۔ جن سے ابتداءً بیعت ہو کر حکیم صاحب نے روحانی استفادہ کیا۔ آخر میں حیدرآباد دکن کے ایک اور مشہور و معروف بزرگ مچھلی والے شاہ صاحب سے بھی روحانی استفادہ کیا۔

عشقِ رسولؐ :۔

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حکیم صاحب کا قلب سرشار تھا۔ زندگی کے آخری دور میں بارہا مرتبہ سعی کی کہ مدینہ طیبہ ہجرت کر جائیں لیکن باوجود کوششوں کے اس کا موقع نہ مل سکا۔ مدینہ طیبہ کے رہنے والوں سے خصوصاً اور عرب کے رہنے والوں سے عموماً بے حد محبت کرتے تھے۔ اپنے والد کی تعمیر کی ہوئی مسجد کے قریب ایک مہمان نواز سرائے تعمیر کرائی تھی تاکہ عام مسافروں اور خصوصاً عربوں کو قیام میں سہولت ہو۔

یہ رباط (سرائے) رباط الحکیم کے نام سے آج بھی مسافروں کے قیام کے لئے وقف ہے اور وسط شہر میں پانچ بتی چوراہے کے قریب واقع ہے۔

استاد سے محبت و عقیدت :۔

اپنے استاد محترم مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتے

تھے۔ جس زمانہ میں بغرض تعلیم خیر آباد میں مقیم تھے حکیم صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا کو سیتا پور کی فلاں دوکان کے کباب بہت پسند ہیں۔ حکیم سید برکات احمد بلاناغہ ریل سے سیتا پور جاتے اور علامہ کے لئے کباب لے کر آتے چند دن تک تو علامہ نے اپنے عزیز شاگرد کی یہ زحمت گوارا کی۔ آخر علامہ نے منع فرما دیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہر سال اپنے استاد کی قدم بوسی کے لئے پابندی سے خیر آباد حاضر ہوتے تھے۔ علامہ خیر آبادی کی وفات پر ایک رسالہ حسرت العمار بر وفات شمس العلماء کے نام سے لکھا۔

وفات :۔

حکیم سید برکات احمد کے ایک صاحبزادے مولانا حکیم سید محمد احمد صاحب تھے۔ جو علم و عمل کے اعتبار سے ان کے حقیقی جانشین تھے۔ معنوی اور مناصب سرکار سے وہی حکیم صاحب کے صحیح قائم مقام ہوئے۔ انھوں نے بھی کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

حکیم سید محمد احمد کی اولاد میں ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے حکیم مولانا محمود احمد برکاتی اور سید مسعود احمد برکاتی ہیں۔ سید مسعود احمد برکاتی کراچی میں مطب کرتے ہیں اور جو وقت بچتا ہے تصنیف و تالیف میں گزارتے ہیں۔ ان کی کئی ٹھوس اور اہم تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ کراچی کے ان دانشوروں میں ہیں جو نام و نمود سے بے نیاز ہو کر ریسرچ اور علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں اور غالب کے اس مصرعہ کے بقول ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

ان کے چھوٹے بھائی سید مسعود احمد برکاتی ہمدرد کراچی کے شعبہ تالیف و تصنیف و ترجمے میں ناظم ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب کی دور رس نگاہ نے ان کے جوہر قابل کو پرکھا۔ اور اپنے دفتر کی زینت بنا لیا۔

مختصر یہ کہ دونوں برادر پیکر شرافت و نجابت ہیں اور ان کو دیکھ کر بے اختیار جوش کا یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا ہے۔

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

تصانیف :۔

حکیم مولانا برکات احمد صاحب کی جو فلسفیانہ تصانیف منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں سے بعض کتب کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ انہارِ اربعہ تصوف میں۔
۲۔ القول القابط فی تحقیق۔
۳۔ الوجود الرابط۔
۴۔ امام الکلام فی تحقیق الاجسام۔
۵۔ فلسفہ میں حاشیہ بر حاشیہ خیر آبادی۔
۶۔ حاشیہ شرح مواقفت کلام میں۔
۷۔ حاشیہ بر جامع ترمذی (حدیث شریف میں)
۸۔ عشرہ کاملہ۔ (طبعیات میں)
۹۔ حقیقت الاسلام (〃)
۱۰۔ رسالہ وجود رابطی (منطق میں)
۱۱۔ المعارف الدعبہ (الٰہیات میں)
۱۲۔ تنویر المنار (اصولِ فقہ میں)

علامہ اقبال کو حکیم برکات احمد صاحب کا ایک رسالہ بعنوان تحقیق زمان پورا نام رسالہ اتقان العرفان فی ماہیتہ الزمان" کو عرصہ تک تلاش رہی۔ ان کی تصانیف بڑے پایہ کی ہیں۔

طبی معرکے :۔

حکیم صاحب ایک مستند اور متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فن طب پر بھی گہرا عبور رکھتے تھے۔ ان کی تجویز و تشخیص اور معالجانہ نظر بڑی گہری تھی۔ مرض کتنا ہی پیچیدہ اور پرانا کیوں نہ ہو وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتے تھے وہ اکثر فرمایا

کرتے تھے کہ طبیب کے دل میں اگر خوف خدا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک و صاف نہ ہو تو اس کے ہاتھ سے شفاء بھی اٹھ جاتی ہے۔ طبیب صحت و عزت کا امین ہوتا ہے اسے امانت میں کبھی بھی خیانت نہ کرنا چاہیے۔

ایک مریض جس کو دستوں کی پرانی شکایت تھی اور بہت دور دراز تک کے ڈاکٹروں کا علاج کر لیا تھا لیکن افاقہ کی کوئی شکل نہیں ہو رہی تھی اس لئے حکیم صاحب کا نام سن کر علاج کے لیئے حاضر ہوا تھا۔ اور اپنے اس مرض کی وجہ سے لب مرگ تھا۔ آپ نے جوارش مصطگی وغیرہ پہلے دی لیکن افاقہ نہ ہونے پر اپنے مجربات سے ایک گولی تیار کرائی جس کا نسخہ حسب ذیل ہے۔

نسخہ :-

کیلہ عدد وتازہ رات کو پانی میں بھگو دیں۔ پانی کیلوں سے دو انگل اوپر رہے صبح ان کیلوں کو اتنا پکائیں کہ پانی جل جائے اور کیلے (اذاراقی) سیاہ رنگ کے ہو جائیں۔ پھر انھیں کوٹ کر رکھ لیں۔ کیلوں کا یہ سفوف فلفل سیاہ (کالی مرچ) گل ازمی افیون ہر ایک ایک تولہ لے کر باریک پیس کر مونگ کے دانہ کے برابر گولیاں بنا کر رکھ لے۔ روزانہ تین گولیاں عرق بادیان و عرق پودینہ کے ہمراہ استعمال کریں۔ چند دنوں تک یہ گولیاں مریض کو استعمال کرائی گئیں جس سے مریض کی بہت پرانی شکایت دور ہو گئی۔

ایک شخص کو ٹونک میں سکتہ ہو گیا اور دو یوم گزر گئے۔ تمام اطبائے عصر نے متفقہ طور پر تشخیص کیا کہ مر گیا ہے۔ مریض کو مردہ سمجھ کر تجہیز و تکفین کا سامان کیا جا رہا تھا کہ اسی دوران آپ کو مریض کے دیکھنے کا موقع ملا۔ مریض کا بغور مطالعہ اور معائنہ کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ مردہ نہیں ہے ابھی اس میں زندگی کی علامات موجود ہیں۔ اور اس کو کل صبح ہوش آجائے گا۔ بطور دوا تریاق کبیر یا دا مسیس حل کر کے حلق کے اندر ڈال دینے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر صبح کو بالکل ہوش آ گیا۔ پورے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ حکیم برکات احمد صاحب کی کرامت سے مردہ زندہ ہو گیا۔

اسی طرح نواب صاحب ٹونک کے محل میں ایک بیگم صاحبہ کی بینائی کمزور ہوگئی اور انھیں زیادہ نمبروں کا چشمہ لگنے لگا۔ انھوں نے حکیم صاحب سے خواہش کی آپ کوئی ایسا نسخہ لکھ دیں کہ عینک کی عادت چھوٹ جائے۔ حکیم برکات احمد صاحب نے مریضہ کے لئے مندرجہ ذیل نسخہ ترتیب دیا۔

چینی دس تولہ، شورہ پانچ تولہ، سبز چوڑی کا کانچ ڈھائی تولہ، کباب چینی ڈھائی تولہ سب کو نہایت باریک پیس کر آب باران میں ایک ماہ کھرل کیا جائے۔ اب اس میں مروارید ناسفتہ ۲ تولہ ڈال کر خوب کھرل کیا جائے۔ جب یہ سب مثل سرمہ ہو جائے چھان کر شیشی میں محفوظ کر لیں۔

مہینہ دو مہینہ یہ سرمہ بیگم صاحبہ نے استعمال کیا اور اس کے نتیجہ میں ان کی عینک (چشمہ) لگانے کی عادت چھوٹ گئی۔

مسیح الملک حاذق الملک

حکیم حافظ اجمل خاں شیدا

۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۴ء — ۱۹۲۷ء

مسیحائے ہند

تاریخ طب میں ایسی بے شمار نادر روزگار ہستیاں ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے کارناموں سے نہ صرف اپنا نام روشن کیا بلکہ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے اس فن کو اور اپنے سلسلۂ نسب کو بھی حیاتِ جاودانی عطا کردی۔ ایسی ہستیوں اور شخصیتوں میں حکیم اجمل خاں کا نام نامی واسم گرامی بھی صفِ اول میں آتا ہے۔

میدانِ طب کی ایسی ہستی کو جتنی بے شمار انعامات۔ اعزازات خلعتیں ملی ہیں اتنی شاید طِب کی کسی دیگر ہستی کو آج تک نہیں ملی ہیں۔

خاندانِ شریفی کا یہ چراغ جب تک جلتا رہا روشنی دیتا رہا اور اپنے بعد روشنی کا وہ عظیم مینارہ قائم کر گیا کہ جب تک دنیا ہے اس مینارۂ روشنی سے فیضیاب ہوتی رہے گی۔

خاندان:۔

حکیم اجمل خاں کا خاندان وہی مشہور خاندان ہے جو تاریخ میں خاندان شریفی کے نام سے منسوب ہے اور جس کے جدِ امجد طب حکیم فاضل خان تھے لیکن ان کی چوتھی پشت میں جو طبیب ہوئے۔ ان کے ہی نام پر خاندانِ شریفی منسوب ہوا۔

حکیم محمد شریف خان مرحوم اپنے زمانے کے بے نظیر طبیب تھے۔ علم وعمل کے

مجدد طب حاذق الملک بہادر حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم رئیس اعظم دہلی۔

لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ صاحب تالیف و تصنیف تھے۔ متعدد کتابیں لکھیں اور متعدد درسی کتب پر حاشیئے لکھ کر ان کے اہم اور پیچیدہ مسائل کو سلجھایا۔ آپ کے بعد حکیم صادق علی خاں اور پھر حکیم محمود خاں نہایت بلند پایہ طبیب ہوئے ہیں۔ حکیم محمود خاں مسیح الملک کے والد ماجد تھے اور بہت سی خوبیوں کے مالک۔

حکیم محمود خاں مرحوم کے ۳ تین فرزند تھے جنھوں نے فن طب کو فنا ہوتے دیکھ کر مدرسہ طبیہ قائم کیا۔ اور بعد میں مسیح الملک کی انتھک کوششوں کی بدولت طبیہ کالج بنا۔

حکیم محمود اصل خاں مرحوم منجھلے فرزند تھے اور مسیح الملک حکیم اجمل خان سب سے چھوٹے فرزند تھے جن کا ذکر یہاں خصوصیت سے مقصود ہے۔

غرضکہ حکیم اجمل خان کے آباء و اجداد مغل عہد میں ہندوستان وارد ہوئے ان کا سلسلۂ نسب اگر باپ کی جانب سے حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے تو ماں کا شجرہ حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔

پیدائش:-

حکیم محمد اجمل خان کی پیدائش ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۴ء دلی کے ایک عالی رتبہ رئیس اور فن طب کی تاریخ میں معروف شریف منزل میں ایک ایسا آفتاب طلوعِ سحر ہوا جس کی روشنی کی کرنیں سرزمینِ ہند سے نکل کر عرب و عجم۔ مصر و حبش اور یورپ تک جا پہنچی۔

وضع قطع۔ یعنی لباس۔

ابتدا میں حکیم صاحب قبلہ وہی طرز لباس پسند فرماتے تھے جو ان کا خاندانی لباس تھا یعنی دو کلیہ ٹوپی۔ کچی ململ کا انگرکھا چست پاجامہ۔ دہلی کی زری کی جوتی۔ سردی کی شدت کے وقت ایک نیمہ آستین۔ ایک ہلکی اونی چادر کا سردی میں اضافہ۔
یہ ان کا خاندانی لباس تھا جو خاندان شریفی کے بزرگ اور اطبا عموماً پہنتے تھے۔
لیکن رام پور سے واپسی کے بعد خاندانی رسم و رواج کے خلاف خدمت پسندی

کی وجہ سے اور تحریک علی گڑھ سے متاثر ہوکر علی گڑھ فیشن اختیار کرلیا تھا۔ خاندانی
لباس کے بعد ترکی ٹوپی اوڑھنے اور شیروانی وقمیص پہننے لگے تھے۔ پاجامہ گوچست
نہ ہوتا تھا مگر آری تراش کا سیدھا پاجامہ بغیر چوڑی کا استعمال کرنے لگے تھے۔
وہ بلا تکلف اونی گرم کپڑے اعلیٰ قسم کی سرج جامہ دار اور عمدہ کشمیرے کے
بنے ہوئے پہنتے تھے۔

تحریک آزادی سے وابستہ ہونے کے بعد ترک موالاتی کی شکل میں کھدر
میں ملبوس رہنے لگے تھے اس پرطرہ یہ کہ پہلے تو ترکی وضع کی کھدر کی عنابی رنگ
کی ٹوپی اس کے بعد کھدر ہی کی کشتی نما ٹوپی پہننے لگے تھے۔ وسط سال ۱۹۲۵ء
میں جب وہ شام، فرانس اور یوروپ کی سیاحت پر گئے تھے تو انگریزی وضع قطع
کا لباس یعنی انگریزی سوٹ اور ہیٹ بھی استعمال کرنے لگے تھے۔

تعلیم وتربیت:

چونکہ گھرانہ علمی ادبی ماحول سے پُر تھا لہٰذا یہ ماحول حکیم صاحب کو بھی ملا۔ اور
حسب دستور ابتدائی تعلیم کی ابتدا گھر سے ہی شروع کی۔ ان دنوں شریف خانی
خاندان کے مخصوص وقار اور حکیم محمود خاں کی بلند مرتبہ شخصیت کی وجہ سے شریف
منزل میں علماء کا مجمع رہا کرتا تھا۔ اور یوں بھی اُس زمانے میں رؤسا اپنے بچوں کی
تعلیم کا انتظام گھر پر ہی کرتے تھے۔ اس لئے حکیم اجمل خاں کی تربیت اور ابتدائی
تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ مگر ان کے ذوق علم نے ان کو رسمی قیود کا پابند نہیں رکھا۔ اور وہ
اپنی علمی تشنگی کو دور کرنے کے لئے دہلی کے ارباب علم ہنر و کمال کی خدمت میں جانے
میں عار نہیں محسوس کرتے تھے۔

حکیم صاحب نے اٹھارہ سال کی عمر تک منطق، فلسفہ، طبعیات ادب حدیث
تفسیر اور فقہ وغیرہ کی تکمیل کرلی تھی۔

صرف ونحو میں ان کے استاد پیر جی صدیق احمد صاحب دہلوی تھے منطق
اور فلسفہ شمس العلماء، مولوی عبدالحق مرحوم مفسر تفسیر حقانی اور مولوی عبدالرشید
صاحب رامپوری سے حاصل کی اور دیگر علوم مرزا عبیداللہ بیگ حکیم مولوی

جمیل الدین اور دیگر اساتذہ سے پڑھے۔
مندرجہ بالا علوم کے علاوہ خوشنویسی کی تعلیم خلیفہ محمد امیر پنجہ کش اور مولوی رضی الدین سے حاصل کی۔
معقول و منقول کی تعلیم کے ساتھ خاندانی رسم ورواج کے مطابق تعلیم طب کی جانب خصوصی توجہ دی۔

طب کی تعلیم:-

طب کی ابتدائی کتب اپنے والد گرامی حکیم محمود خاں صاحب سے اور انتہائی کتب اپنے برادر بزرگ حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے پڑھیں۔ خاندان شریفی کے ایک مشہور بزرگ حکیم غلام رضا خان تھے۔ ان کو قانون پر ملکہ تھا۔ حکیم اجمل خان نے اپنے والد گرامی اور برادر کلاں کے علاوہ ان سے بھی طب میں فیض حاصل کیا۔
اس کے ساتھ ہی ساتھ فن نباضی مطب اور نسخہ نویسی جو ایک حکیم کے لئے لازمی تعلیم ہے اپنے والد قبلہ کے ساتھ اور بعد میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مطب میں بیٹھ کر حاصل کی۔ قرآن مجید پہلے ہی حفظ کر چکے تھے۔
چونکہ حکیم اجمل خان کو مطالعہ کا بچپن سے ہی حد درجہ شغف تھا۔ جب کچھ تعلیم اچھی ہو گئی تو انھوں نے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ مطالعۂ کتب پر صرف کرنا شروع کر دیا۔
شاہان مغلیہ کے عہد میں علم دوست خاندان قلمی کتابوں کو عموماً جمع کرتے رہتے تھے اور غدر سے پہلے دہلی میں متعدد خاندانوں میں گراں قدر کتب خانہ تھے۔ مگر جب غدر میں دہلی برباد ہوئی اور شرفاء کو اپنی عزت اور جان کا بچانا مشکل ہو گیا تو ایسے حالات میں یہ کتب خانے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ یہ علمی و ادبی خزائن بھی لٹ پھنک اور ضائع ہو گئے۔ حسن اتفاق سے مرزا غالب کی طرح حکیم محمود خان کا یہ مکان "شریف منزل" بھی راجہ نریندر اور مہاراجہ پٹیالہ کی سعی سے لٹنے سے محفوظ رہا اور خاندان شریفی کا یہ علمی خزانہ تلف ہونے سے محفوظ رہ گیا۔[11]
حکیم اجمل خان کے لئے یہ علمی خزانہ ایک نعمت خداداد ثابت ہوا اور انھوں نے مستقل طور پر اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اس کے مطالعہ میں صرف کرنا شروع کر دیا

چونکہ شریف منزل میں مرضاء و شرفاء کی آمد کی بنا پر وہ گوشۂ تنہائی میسر نہیں آسکتا تھا جولیلائے علم کے طلب گاروں کے لیئے ضروری ہے۔ اس لیئے انھوں نے ــــــ شریف خاں کی مسجد کے ساتھ والا کوٹھا اپنے لیئے مخصوص کر لیا جو اس مکان کے قریب ہے جس میں مرزا غالب اخیر میں منتقل ہو گئے تھے۔ اور جس کے متعلق غالب نے فرمایا تھا۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

حکیم اجمل خاں کے اس شوق مطالعہ و ذوقِ علم کی وجہ سے حکیم محمود خاں یعنی اُن کے والد اُن کو مُلّا کہا کرتے تھے اور بعض اوقات ان کے غیر معمولی انہماک پر تعریض بھی فرمایا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کا مطالعہ صرف طب کی کتابوں تک محدود نہ تھا بلکہ ادب۔ تفسیر منطق اور فلسفہ کی کتابوں کا بھی وہ گہری نظر سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مطالعہ کے بعد دِقت طلب مسائل کے حل کے لیئے حکیم عبد المجید حکیم غلام رضا اور حکیم عبد الرشید خاں صاحب جیسے اساتذۂ فن سے مشکلات کے حل میں مدد بھی لیا کرتے تھے۔

جس دقتِ نظر کے ساتھ انھوں نے طبّی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد کتابوں پر ان کے تحریر کردہ حواشی پائے جاتے ہیں۔

اس مطالعہ و نظر نے ان کی آئندہ زندگی پر انقلاب انگیز اثر پیدا کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ متاخرین نے تقلیدِ محض کا راستہ اختیار کر کے طب کی ترقی کو روک دیا ہے اور اسی لیئے وہ زیادہ تر لفظی بحثوں میں الجھ گئے ہیں انھوں نے [illegible] کیا کہ طب میں فلسفہ اور طبعیات کی آمیزش تنبع کے مسالک [illegible] اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ انھیں دورانِ مطالعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ جالینوس اور بوعلی سینا کے بہت سے نظریات قابلِ تنقیح ہیں اور اگر ان کی جلد تنقیح نہ کی گئی تو طب قدیم کا یہ قلعہ کسی دن منہدم ہو جائے گا۔

یہ تمام خیالات دل و دماغ میں موجزن مگر ان خیالات کی تکمیل کسی صورت سے ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ اسی دوران ایک تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے ان کے

خیالات کو مزید تقویت ہو گئی۔

طب کی تعلیم کا اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خاندان کے مختلف بزرگ اپنے اپنے مطب میں طلباءِ طب کو درس دیتے تھے کوئی باقاعدہ درسگاہ نہ تھی۔ اسی دوران سرسید احمد خان نے مدرسۃ العلوم کی تحریک شروع کی۔ اگرچہ ابتدا میں سرسید کی سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید کے پختہ عزم و استقلال اور خلوص و ایثار نے اس تحریک کو کامیاب کر دیا۔ اس طرح مختلف علوم کے مدارس کے قیام کی جانب عوامی توجہ مبذول ہو گئی۔ شریف خانی خاندان بھی اس سے متاثر ہوا اور ایک طبی مدرسے کے اجراء کے مشورے ہونے لگے۔ اور آخر حکیم عبدالمجید نے ۱۸۸۲ء میں مدرسہ طبیہ کا افتتاح کر دیا ایسے موقع پر حکیم اجمل خاں کی عمر انیس (۱۹) سال تھی تاہم انھوں نے مدرسہ میں پوری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اسی زمانے میں ان کو طبِ یونانی کے متعلق بحث و نظر کا موقع ملا اور وہ اپنے استاد طب حکیم مولوی عبدالرشید خاں اور مولوی حکیم جمیل الدین سے تبادلۂ خیالات بھی کرتے رہے کیونکہ اساتذہ سے استفادہ میں کوئی جھجک مانع نہیں تھی۔

مدرسہ کے قیام کے کچھ عرصہ کے بعد نصابِ تعلیم میں جدید تشریح و جراحت کا اضافہ کیا گیا درحقیقت یہ اضافہ حکیم صاحب کی کوشش سے طب یونانی کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے کیا گیا تھا کیونکہ حکیم صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ حکماءِ قدیم مثلاً التصریف زہراوی اور الکافی ہارون بن موافق اللہ کے مطابق تشریح الاعضا اور عملِ بالید میں کتنی مہارت رکھتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں حکیم صاحب کو ریاستِ رام پور میں طبیب خاص اور میڈیکل آفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ ریاستِ رام پور کے شریف خانی خاندان سے دیرینہ مراسم اور تعلقات تھے۔ ریاست کی جانب سے اس خاندان کا وظیفہ بھی مقرر تھا۔ اور وقتِ ضرورت حکیم عبدالمجید خاں خود ریاست میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ریاست کے نواب صاحب کی اس خواہش پر کہ حکیم عبدالمجید اپنے ایک بھائی کے قیام رامپور میں اجازت مرحمت فرمائیں حکیم اجمل خان کا تقرر میڈیکل آفیسر کے طور پر عمل میں آیا تھا۔

دورانِ قیام رام پور حکیم صاحب کا تقرر چار سو روپیہ ماہوار ہوا تھا لیکن ان کی علمی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر چار سے چھ سو پھر آٹھ سو اور بعد میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہو گیا۔ یہاں حکیم صاحب نے رام پور کے کتب خانے جس کے بعد میں وہ انچارج بھی ہو گئے تھے ایک ایک کتب کا بغور مطالعہ کیا اور ان نایاب کتابوں کی نقل کی اور کرائی جو خاندانِ شریفی کے کتب خانے میں موجود نہ تھیں۔ کتب خانہ رام پور اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ان کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا جہاں دنیا کی نایاب و کمیاب کتب جمع تھیں۔ چنانچہ شریف خانی کتب خانہ کی بعض اہم کتابیں مثلاً جالینوس کا لکھا ہوا رسالہ نبض اور تلخیص المفتاح (جو جالینوس نے بقراط کے اقوال کی شرح میں لکھی ہے) اور المنقذ من الہلکہ فی دفع مضار السمائم المہلکہ۔ التصریف لمن عجز عن التالیف جصہ جراحت ترویح الدرواح فجندی وغیرہ رام پور کے کتب خانہ سے ہی نقل کی گئی ہیں۔

قیام رام پور میں حکیم صاحب نے ادبیات عرب کی بھی تکمیل کی فی الحقیقت حکیم اجمل خاں دنیا کے بڑے آدمیوں کی طرح خود بھی ادب کی جانب طبعی رجحان رکھتے تھے لیکن طب کے خاندانی شغل ہونے کی بنا پر وہ ادب کو منتہائے مقصود نہیں بنا سکتے تھے دہلی میں دیگر علوم کی طرح عربی و فارسی کی تکمیل ضرور کی تھی مگر ایک طالب علم کی طرح تشنگی ابھی باقی تھی۔ اس وقت عربی کے مشہور عالم مولانا محمد طیب عرب وہاں موجود تھے جو عربی کے صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے ایسے موقع پر بلا تکلف مولانا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا حکیم صاحب کو عربی میں تحریر و تقریر کی جو بے نظیر مہارت تھی جس کی بنا پر اکثر لوگ متحیر رہ جاتے تھے وہ درحقیقت مولانا کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا۔ حکیم صاحب کے اس ادبی کمال کی وجہ سے علماء بہت متاثر ہوتے تھے چنانچہ جب عراق میں علماء سے تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا تو وہ سب کے سب حکیم صاحب کی سلیس و شگفتہ تحریر و تقریر سے متحیر ہو گئے تھے۔ اسی طرح مصر اور پیرس میں سعد زغلول پاشا اور دوسرے مشہور خطیب حکیم صاحب کی اس عربی دانی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی

جو عربی ادب کے مشہور نقاد اور صاحب علم تھے انھوں نے حکیم صاحب کے متعلق فرمایا تھا کہ "میری نظر میں ہندوستان بھر میں حکیم اجمل خاں سے زیادہ کوئی شخص قابل عزت نہیں ہے کیونکہ علم و امارت کا ان سے بہتر پیکر ملنا مشکل ہے۔"

قیام رامپور میں حکیم صاحب کے اس فارسی ذوق کی بھی نشو و نما اور جلا ہوئی حکیم صاحب کا مکان مرزا غالب کے مکان کے قریب ہی تھا اور مرزا غالب فارسی کے بہترین شاعر اور ماہر تھے اور ریاست رام پور نے غالب کو افکار معیشت سے آزاد کر کے تا حیات سخن بخشے ہیں اگر مدد کی تھی تو حکیم اجمل خاں کو فارسی و عربی کا بہترین ادیب اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہونے میں بڑی مدد دی۔

حکیم صاحب کے قیام رام پور کے زمانہ میں دربار رام پور میں اردو فارسی اور عربی کے بہترین ادیب جمع تھے اور شعر و سخن کی مختلف نشستیں، مذاکرے مجالس اور صحبتیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں نواب صاحب اور حکیم صاحب دونوں شریک ہوا کرتے تھے۔

حکیم صاحب رام پور میں مطب بھی کیا کرتے تھے رام پور میں اس وقت متعدد معروف طبیب بھی موجود رہتے تھے۔ حکیم صاحب کا مطب تھوڑے سے عرصہ میں مرجع خلائق بن گیا تھا لیکن حکیم صاحب مقامی طبیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح حکیم صاحب کے نواب صاحب اتنے گرویدہ ہو گئے تھے کہ صرف علاج و معالجہ ہی میں نہیں بلکہ ریاست کے تمام امور مہمہ میں نواب صاحب کے مشیر خاص ہو گئے تھے بعض اوقات ریاست کے معاملات میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں مگر حکیم صاحب کا ناخن تدبیر ان گتھیوں کو آسانی سے سلجھا لیتا تھا۔

ریاست میں اثر و رسوخ میں حکیم صاحب کی شخصیت نواب رام پور ہز ہائی نس سر سید حامد علی خاں کے بعد سب سے زیادہ نمایاں تھی اگر حکیم صاحب دربار میں اس قدر اثر انداز تھے کہ ان کے مشورے سے اہم امور طے پاتے تھے تو دوسری جانب جمہور میں اس قدر ہر دل عزیز تھے کہ رام پور کے باشندے ان کا دلی احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ شرفاء کی اعانت اور غرباء کی دستگیری کرتے رہتے تھے

اس کے باوجود حکیم صاحب نے اپنے ذاتی مفاد یا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کبھی نہیں کی حالانکہ اس درجہ ریاستی امور میں غلبہ رکھنے کے بعد وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ان کا مزاج بالکل نواب وقارالملک کی طرح تھا اور وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ کوئی امر ان کے خاندانی وقار کے خلاف سرزد نہ ہو۔

قیام رام پور کے زمانہ میں حکیم صاحب کی تحریک پر نواب محسن الملک مرحوم علی گڑھ کالج کی جانب سے ایک ڈیپوٹیشن لے کر گئے جس میں نواب صاحب رام پور نے پچاس ہزار کا گراں قدر عطیہ عنایت کیا تھا۔ حکیم صاحب ہی کی وجہ سے رام پور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کامیاب جلسہ بھی ہوا اور اسی زمانے میں حکیم صاحب علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی بھی مقرر ہوئے تھے۔

ہز ہائی نس نواب صاحب پر حکیم صاحب کے غیر معمولی اثر و رسوخ کی بنا پر دربار میں بعض مخالفین بھی پیدا ہو گئے تھے لیکن نواب صاحب نے غیر معمولی اعتماد اور حکیم صاحب کی محتاط روش کی بنا پر یہ حاسدین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ پھر بھی ایک بار نواب صاحب اور حکیم صاحب میں غلط فہمی پیدا ہو گئی لیکن نواب صاحب لوہارو کی مداخلت اور مساعی جمیلہ سے یہ آپسی غلط فہمی دور ہو گئی اور اس قدر تعلقات استوار ہو گئے کہ صرف موت کا زبردست پنجہ ہی ان دونوں کو آپس میں دور کر سکا۔ اس غلط فہمی کی تفصیل آگے درج ہے۔

نواب صاحب رام پور صبح چھ بجے سے شام کے ۴ بجے تک سوتے تھے اس لئے دن کا یہ حصہ حکیم صاحب کے لئے اکثر و بیشتر فرصت کا ہوتا تھا۔ حکیم اجمل خاں قیام رام پور میں صبح چھ بجے سو کر اٹھتے تھے اور ضروریات و حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر کے صبح کے ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک مطب میں مریضوں کو دیکھتے تھے اور ۱۰ بجے کے بعد شام ۴ بجے یعنی نواب صاحب کے سو کر اٹھنے تک عبدالصمد خاں چیف سکریٹری ریاست رام پور کے ساتھ گزرتا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا جو انگریزی طرز کا ہوتا تھا۔

اس دوران ملاقاتی اور اسٹاف کے لوگ بھی البتہ رہتے تھے۔ شام ۴ بجے سے قبل جملہ متعلقہ احباب و اسٹاف کے ساتھ چائے ہوتی تھی۔ ۴ بجے نواب صاحب کے

بیدار ہونے ہی سارا اسٹاف کمربستہ اور مصروفِ عمل کاروبار ریاست ہو جاتا تھا اور ڈو گھنٹے تک نواب صاحب ریاست کے کاروبار اور کاغذات دیکھنے کے بعد پھر حکیم صاحب کو اپنے قریب بلا لیتے تھے۔ جو رات کے ۲ بجے تک ساتھ رہتے تھے۔ اس بیچ رات کے کھانے ۹ بجے سے قبل نواب صاحب اندرون محل بیگمات کے پاس جاتے تھے تو حکیم صاحب اس درمیانی وقفے میں بلیرڈ کے کھیل سے محظوظ ہوتے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے نواب صاحب اور لواحقین مع حکیم صاحب کے کھانے کی میز پر موجود ہو جاتے تھے جن کی تعداد تقریب اکیس ہوتی تھی اور کبھی کبھی کسی خاص مہمان کے آ موجود ہونے پر ان اکیس شرکاء میں سے کسی کو قطع کر دیا جاتا تھا۔ اگر کبھی شب ۲ بجے سے پہلے حکیم صاحب کو نواب صاحب کی خدمت سے چھٹی مل جاتی تو یہ وقفہ حکیم صاحب کا مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دن میں بھی دوا خانہ سے فرصت کے بعد حکیم صاحب ان کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔

ایام محرم میں اوقات شب میں نواب صاحب کے ساتھ حکیم صاحب شریکِ مجالس ضرور ہوتے تھے مگر نواب صاحب یا دیگر شرکاء و رفقاء کی طرح کبھی ماتم یا نوحہ خوانی کبھی نہ کرتے تھے جیسا کہ دیگر درباری اور خوشامدی لوگ کرتے تھے نواب صاحب کی سالگرہ کے موقع پر عوام و خواص کی نظریں نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی جاتیں اور نواب صرف ان پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب نے قبول کر لی ہیں مگر حکیم صاحب کا جو تحفہ پیش ہوتا تھا وہ نواب صاحب نہ صرف قبول ہی کرتے تھے بلکہ احتیاط خاص سے اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے حکیم صاحب کا یہ تحفہ عام طور پر دو اشرفیاں اور ایک خوبصورت سی سنہری شیشی ہوتی تھی جو حکیم صاحب کے لئے خاص طور پر تیار کی جاتی تھیں ان شیشیوں میں ایک خاص گولیاں ہوتی تھیں جو صرف نواب صاحب کے لئے مخصوص تھیں۔ اگر گورنر اودھ (یوپی) کبھی رام پور تشریف لاتے تو حکیم صاحب قبلہ کو بھی دہلی سے نواب صاحب ضرور بلاتے تھے رام پور سے ہی حکیم صاحب کے تعلقات سر جیمس سٹن اور سر ہارکورٹ بٹلر نیز دیگر ذمہ دار انگریزوں سے وسیع ہوئے تھے۔ نواب رام پور اور حکیم صاحب کے تعلقات اتنے زیادہ وسیع ہو گئے تھے کہ

حکیم صاحب یا نواب رام پور کو ایک دوسرے کے بغیر سکون نہ رہتا تھا۔
حسب ذیل واقعات سے ان تعلقات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) نواب رام پور کو جب کبھی حکیم صاحب کو بلانا اور ملنا مقصود ہوتا تو اپنے بیٹا یا پرائیوٹ سیکرٹیری کو حکم دیتے کہ فوراً حکیم صاحب کو تار دو کہ براہ مہربانی پہلی ٹرین سے رام پور تشریف لائیں۔ وہ فوراً حکم کی تعمیل کرتے تھے اس کے گھنٹہ یا دو گھنٹہ کے بعد پھر دریافت فرماتے کہ حکیم صاحب کو کسی نے بلایا کہ نہیں جواب دیا جاتا کہ حضور تار دیا ہے۔ حکم ہوتا کہ مجھے انتظار ہے ایک تار اور بھیجو۔ اس کی بھی تعمیل کی جاتی۔ اسی طرح ہر گھنٹہ میں بار بار دریافت فرمانے اور تار بھجواتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حکیم صاحب کا جواب پہنچ جاتا کہ میں فلاں گاڑی سے رام پور پہنچتا ہوں پس اطمینان ہو جاتا اور اب اس گاڑی کا انتظار شروع ہوتا وہ حکیم صاحب کی آمد کی گھڑیاں گنتے تھے اور بے چین رہتے تھے۔ یہ حال تھا نواب صاحب کی حکیم صاحب کے ساتھ گرویدگی کا۔ خدا جانے حکیم صاحب نے کیا جادو کر دیا تھا کہ نواب صاحب کو حکیم اجمل خاں کے بغیر چین نہ ہوتا تھا۔ جب وہ رام پور میں رہتے تھے اور حد درجہ انتظار رہتا تھا جب وہ دہلی یا دیگر کسی مقام پر رہتے تھے اور اگر بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوتی تھی تو بہت بے تابی کے ساتھ بغلگیر ہو جاتے تھے۔

(۲) چنانچہ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو حکیم اجمل خاں جب اپنے اسفار یوروپ و فرانس سے واپس آئے تو بے شمار دوست احباب اور مداحوں نے ان کو گھیر لیا اور ہار پھول پہنائے۔ اسی دوران حکیم صاحب کو اطلاع دی گئی کہ نواب صاحب رام پور بندرگاہ کے باہر ایک طویل وقفہ سے اپنی موٹر میں آپ کے منتظر ہیں۔ یہ سنتے ہی حکیم صاحب فوراً باہر کی جانب چلے جب بندرگاہ کے باہر حکیم صاحب آئے تو نواب صاحب کو موٹر میں منتظر بیٹھا پایا۔ حکیم اجمل خاں کو پھولوں اور ہاروں سے لدا پھندا دیکھ کر نواب صاحب موٹر سے اتر کر حکیم اجمل خاں سے بغلگیر ہو گئے اور نواب صاحب کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ "حکیم صاحب آپ کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں" اور آپ نے جس مقصد کے لئے یہ سفر اور میں نے فراق گوارا کیا اس میں بہت

کامیابی تو نظر نہیں آتی۔" آپ کی صحت اس سفر سے کچھ بہت زیادہ تو بہتر نہیں ہوئی۔" غرضکہ یہ عاشق و معشوق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے موٹر میں سوار ہوئے اور مہاراجہ اندور کے بنگلہ میں جہاں نواب صاحب قیام رکھتے تھے روانہ ہوگئے۔

(۳) ایک بار نواب صاحب ہز ہائی نس رام پور بہادر کو ہیضہ کی شکایت ہوئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب کو بلایا گیا جنھوں نے نواب صاحب کے لئے روغن بیدانجیر اور دودھ تجویز فرما کر اپنے سامنے پلوا دیا۔ اور تمام دن غذا میں سوائے دودھ کے دیگر کوئی غذا ان کو نہ دی گئی۔ شب کو آٹھ بجے جو عموماً نواب صاحب کے کھانے کا وقت ہوتا تھا خاصہ پر اس وقت حکیم اجمل خاں مولوی مقبول احمد صاحب مجتہد اور دیگر رؤسا و اراکین ریاست تھے۔ حسب ارشاد معالج خاص حکیم اجمل خاں کے مونگ کی دال کی کھچڑی پتلی پتلی نواب صاحب کے لئے اور حکیم صاحب و دیگر اراکین کے لئے مختلف انواع و اقسام کے کھانے پیش کئے گئے۔ نواب صاحب کو اس دن پورے دن کا فاقہ تھا اور تیل انڈی اور دودھ کا جلاب پہلے ہی دیئے جا چکے تھے اور بالعموم شب کو وہ ایک ہی وقت کھانے کے عادی تھے کیونکہ تمام دن شام تک سوتے تھے مگر اس دن جلاب کی وجہ سے تمام دن جاگتے رہے تھے اس لئے بھوک کا غلبہ شدت سے تھا۔ روزہ داروں کی طرح چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ جب کھچڑی سامنے آئی تو نواب صاحب نے مولوی مقبول احمد صاحب مجتہد سے دریافت کیا کہ "مولوی صاحب حکم ہے۔ ذرا استخارہ دیکھ کر مجھ سے فرمائیے۔ مولوی صاحب نے اپنی تسبیح پر کچھ پڑھا اور پھر کچھ شمار کیا اور کہا حضور ممانعت ہے۔" مجبوراً سب لوگ بیٹھے رہے۔ پندرہ منٹ بعد نواب صاحب نے پھر مولوی صاحب سے استخارہ دیکھنے کی خواہش کی پھر مولوی صاحب نے اسی طرح عرض کیا "کہ حضور اب کی مرتبہ بھی ممانعت آئی۔" اب نواب صاحب کو بیتابی شروع ہو گئی چہرہ پر گاہے ضعف کی زردی اور گاہے غصہ کی وجہ سے سرخی جھلک جاتی تھی۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد پھر مولوی صاحب سے استخارہ دیکھنے کے لئے ارشاد ہوا۔ مولوی صاحب نے بدستور پھر حکم ممانعت فرمایا۔ اب تو حکیم صاحب سے برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ سرکار میں

بحیثیت آپ کا معالج ہونے کے حکم دیتا ہوں کہ آپ فوراً بلا تاخیر کھانا شروع کر دیں۔ نواب رامپور نے اسی وقت کھانا شروع کر دیا۔ اور پھر مجتہد صاحب کے مقدر میں جتنی مغلظات لکھی تھیں وہ ان کو اسی وقت نقد وصول ہوگئیں۔ پھر نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک ہوگئی اور وہ دہلی آ گئے۔

اور اس طرح حکیم صاحب ۱۹۰۲ء میں اپنے وطن دہلی کو رامپور سے تشریف لے آئے۔ اور ۱۹۰۴ء تک حکیم صاحب کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے دو اہم کام کیے۔ ایک تو مدرسہ طبیہ دہلی کا ترجمان مجلہ طبیہ کے نام سے شائع کیا مجلہ طبیہ ماہوار رسالہ تھا جس میں مدرسہ کی خبروں کے علاوہ طبی مضامین ہوتے تھے۔ یہ رسالہ عرصہ تک بہترین خدمات انجام دیتا رہا اور اس کی ادارت کے فرائض زیادہ تر یہ جی حکیم سید عبدالرزاق معلم تشریح الاعضاء کے ذمہ رہی۔ حکیم سید عبدالرزاق اس کو نہایت محنت اور کاوش سے مرتب کرتے تھے۔ اس رسالے کے پہلے سرپرست حکیم واصل خان تھے مگر حقیقتاً پالیسی ڈائریکٹر حکیم اجمل خان ہی تھے۔ حکیم صاحب وقتاً فوقتاً اس میں مضامین بھی لکھتے رہتے تھے جو عام طور پر مقبول ہوتے رہتے تھے۔ ان مضامین میں سب سے پہلا مضمون پانی پر تھا اس مضمون میں حکیم صاحب نے نہایت سیر حاصل بحث کی تھی اور اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا تھا یہ مضمون کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا اہم کام مفرد دواؤں کی بہم رسانی اور مرکب دواؤں کی تیاری کے لئے ایک مرکز کے قیام کا تھا۔

حقیقتاً دور آخر کے مجدد طب اجمل خان اعظم کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے چونکہ مدرسہ طبیہ تو قائم ہو چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابیں پڑھ لینے اور مطب کر لینے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو جاتا تھا۔ جب تک طلباء کو دواؤں کے وسیع علم کے ذاتی مشاہدے کی بنا پر واقفیت نہ ہوتا کہ وہ اصلی نقلی دوا کو شناخت کر سکیں ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اطباء شناخت ادویہ سے قاصر تھے کیونکہ درس و تدریس کے بعد مطب سے سابقہ پڑ جاتا تھا ان حالات میں ضرورت تھی کہ

کہ ایک ایسا دواخانہ قائم ہو جو

۱۔ مدرسہ طبیہ کے طلباء کو شناخت ادویہ اور دواسازی کا علم سکھائے۔

۲۔ مفردات اصلی اور خالص مہیا کرے۔

۳۔ مرکبات اصلی اور اعلیٰ تیار کرے۔

۴۔ ملک کے سامنے تجارت ادویہ کا صحیح طریقہ پیش کرے جس میں تجارتی لوٹ مار نہ ہو۔ بلکہ معتدل تجارتی منفعت کے ساتھ مریضوں اور غریبوں کی ہمدردی کا عنصر غالب ہو۔

۵ ہندوستان میں پیدا ہونے والی ہزارہا جڑی بوٹیوں پر تحقیق کی جائے ریسرچ کی جائے اور اطباء کے ذریعہ ان پر تجربہ کے بعد ان دواؤں کو عوامی خدمت کے لئے عام کیا جائے۔

اس کام کے لئے یونانی اینڈ ویدک میڈسینز لمٹیڈ کمپنی کا اجراء تھا یہ کمپنی مشترک سرمایہ سے قائم کی گئی تھی اور اس کا منشاء صحیح اور عمدہ مفرد و مرکب دواؤں کی فراہمی تھا۔ کمپنی مشترک سرمائے سے جن میں حکیم صاحب کے ذاتی دوستوں نے حصہ لیا جن میں مرزا اکبر علی خان مرحوم رئیس۔ نواب فیض احمد خاں رئیس۔ لالہ جگل کشور وکیل۔ لالہ ہزاری مل جوہری۔ مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی۔ شمس العلماء سید احمد۔ امام جامع مسجد دہلی۔ میر جمال الدین وغیرہ دہلی کے اکابرین اور کچھ باہر کے رؤسا اور معززین شامل تھے۔ شروع میں سرمایہ چند ہزار پر مشتمل تھا اور جوائنٹ اسٹاک کمپنیز ایکٹ کے ماتحت کمپنی قائم کرائی گئی تھی۔

یہ کمپنی فی الحقیقت اس عظیم الشان پروگرام کا ایک جز تھی جو حکیم صاحب نے فن کی ترقی و اصلاح کے لئے تیار کیا تھا۔

اس کمپنی نے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت ترقی کرلی۔ خاندان شریفی کی سرپرستی کی وجہ سے جمہور کو بہت جلد کمپنی کے دواخانہ کی طرف توجہ ہوگئی اور اس کی آمدنی ماہانہ ڈیڑھ دو ہزار تک ہوگئی۔

۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں حکیم صاحب قولنج اور ضعف قلب کے دوروں کی وجہ سے عرصہ تک علیل رہے جس کا سبب منجھلے بھائی حکیم واصل خان کا عین عالم جوانی

ہیں دنیا سے رحلت ہوتا اور بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خان کے انتقال کے وقت غش کھا کر گر پڑے تھے اور عمر بھر اختلاجِ قلب کا جو عارضہ رہا یہ ہی حادثہ اور پھر منجھلے بھائی کے حادثہ نے مل کر ایک عجیب مریض بنا دیا تھا جس سے حکیم صاحب چھٹکارہ نہ پا سکے تھے اس وقت ڈاکٹروں نے یہ تجویز کیا کہ یہ عصب راجع (نیوگسٹریزو) کا درد ہے ان دوروں کی وجہ سے حکیم اجمل خاں بہت کمزور ہو گئے اور کئی ماہ تک مہسرولی لاہور منٹگمری ۔ ملتان کا سفر کیا۔

اسی بیچ قریب ۱۹۰۵ء میں حکیم واصل خان کا انتقال ہوا اور خاندان کے دستور کے مطابق حکیم اجمل خاں ان کے جانشین ہوئے اس وقت بھی حکیم صاحب پر نقاہتِ مرض کا اثر تھا اس لئے جانشینی کے چند روز بعد حکیم اجمل خاں صاحب نے حصولِ صحت کے لئے سفرِ بغداد کا عزم کیا۔ چنانچہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء کو حکیم صاحب اپنے دیگر رفقاء، حکیم مولوی امجد علی آنریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر دہلی اور سید حامد صاحب جو شمس العلماء مولوی سید احمد امام جامع مسجد دہلی کے بھائی تھے) کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس سفر میں حکیم صاحب نے مسقط۔ بصرہ۔ قسطہ العمارہ بغداد کوفہ کربلائے معلیٰ نجف اشرف کے علاوہ عراق کے دوسرے قبات عالیات کی زیارات مقابر کی زیارات اور اکابرینِ عراق سے ذاتی تعلق و ارتباط کا رشتہ قائم ہوا جس سے آپ کی حذاقت اور علمی قابلیت کی بہت شہرت ہوئی بغداد میں متعدد طبی و مذہبی اختلافی مسائل پر حکیم صاحب اور بغداد کے مشہور علماء میں مذاکرہ ہوا اور سب ان کے تبحر اور قادر الکلامی کے قائل ہو گئے اور ۹ جون ۱۹۰۵ء کو حکیم صاحب بخیریت دہلی آ گئے۔ اور اہلِ دہلی نے ان کا استقبال کیا۔

اُدھر حکیم اجمل خان کے سفر عراق و بغداد اسلامیہ کے دوران بنگال میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا انقلابیوں کے ذہن میں تانا بانا بنا جا رہا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس وقت تک سیاسی غلامی کے خلاف ہندوستان کی سرزمین پر کوئی اتنا بڑا مظاہرہ نہ ہوا تھا چنانچہ ۷ اگست ۱۹۰۵ء کو جب کہ ہندوستان پر لارڈ کرزن کی حکومت تھی یہ حکومت کی چال چلی گئی کہ ہندو مسلم تفریق کر کے سیاسی شورش کا رُخ فرقہ وارانہ کشمکش کی جانب پھیر دیا جائے تاریخ مذکورہ بالا

کو تقسیم متحدہ بنگال کا اعلان شائع ہوا

یہ ایک چنگاری تھی جو بنگال کے بارود خانے میں گری

ادھر حکیم صاحب نے ممالک غیر کے اسفار سے آتے ہی سب سے پہلے مطب کی ترقی کی جانب توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصے میں مطب کو نہایت کامیاب بنادیا ان کے مطب میں رجوعات کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح سے ۱ بجے تک اور شام کو دو تین گھنٹے بیٹھتے تھے اور بمشکل مریضوں کا ہجوم ختم ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں وہ کئی کئی سو مریضوں کو دیکھتے تھے۔ مریض نہ صرف مدراس بمبئی اور برما جیسے دور دراز مقامات سے آنے لگ گئے بلکہ ایران، عراق، افغانستان اور ترکستان وغیرہ ممالک غیر کے مریض بھی ان کے مطب کا طواف کرنے لگے۔

حکیم صاحب کے مطب کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے یہاں مطب میں امیر غریب ہندو مسلمان غرضکہ سب کے ساتھ مساوی حیثیت کا برتاؤ ہوتا تھا۔ سی ایف۔ انڈریوز مشہور پادری نے حکیم صاحب اور ان کے مطب کے لیے حسب ذیل الفاظ کہے تھے۔

"حکیم صاحب کی سب سے پہلی ملاقات میرے لئے ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اس سے ہندوستان اور اہل ہند کے متعلق ایک نئی روشنی میرے دماغ پر پڑی میری پرورش اینگلو انڈین کے قدیم گھرانے میں ہوئی تھی اور میرے دماغ میں یہ خیال ٹھونس دیا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان مذہب اور ذات پات کی وجہ سے ایک ایسی خلیج حائل ہے جو کسی طرح پاٹی نہیں جا سکتی۔ مجھے یہ بتلایا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کا اتحاد پانی اور تیل کے اتحاد سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ انگلستان سے دہلی آنے پر میرے اس اعتقاد کو کئی مرتبہ صدمہ پہنچ چکا تھا۔ مگر حکیم صاحب کے مطب کو دیکھ کر تو وہ بالکل پاش پاش ہوگیا۔ میرے ساتھ کے پادری نے مجھے بتایا کہ حکیم صاحب کے مطب میں ہر مذہب و ملت کے اشخاص آتے ہیں اور حکیم صاحب ہر امیر و غریب ہندو مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ میں نے ان غریب ہندو مریضوں کو خصوصیت سے دیکھا جو حکیم صاحب سے بلامعاوضہ مشورہ حاصل کر رہے تھے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ لارڈ ہارڈنگ سابق وائسرائے ہند کے پرائیوٹ سکریٹری

حکیم صاحب سے مشورہ لینے کے لئے آئے۔ وہ حکیم صاحب کے مطب کا منظر دیکھ کر بہت حیران ہوتے اور انھوں نے لارڈ ہارڈنگ سے اس کا ذکر کیا۔ لارڈ ہارڈنگ اس کے بعد حکیم صاحب کو میگنیٹ آف انڈیا (ہندوستان کا مقناطیس) کہا کرتے تھے۔

مطب کی مصروفیات اور مشغولیات کے باوجود حکیم صاحب خاموش نہ بیٹھتے تھے اور طب کی ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے فروری ۱۹۰۶ء میں طبّی تحریک کے لئے ایک قدم آگے بڑھا کر اطباء اور طب یونانی کی بازگشت ایوانِ قصر میں پہنچانے کے لئے طبّی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حکیم صاحب طبِ یونانی اور برادرانِ وطن کی طب ویدک کی متحدہ اور مشترکہ ترقی کے لئے روز اوّل سے ہی کوشاں تھے حالانکہ اس وقت سیاسی نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان اتحاد کا سوال زیادہ نمایاں نہ ہوا تھا۔ پھر بھی حکیم صاحب کی دور اندیشی وقت کے تقاضوں کو بہت پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔

اس کے قبل حکیم صاحب بعض مذہبی تحریکات میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ ریواڑی کے ایک پادری نے اسلام کے خلاف متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں اس نے نہایت دلآزار پیرائے میں حضور پاک کی سیرت پر سخت حملے کئے اور مختلف یتیم مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو عیسائی بنا لیا تھا۔ ان میں سے ایک دہلی کی تھی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ حکیم صاحب بھی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے دہلی کے ایک صاحب دل کی معیّت میں محلہ چتلی قبر میں ایک یتیم خانہ قائم کیا جو ان کے دور میں بہترین انتظامات کے ساتھ چلتا رہا۔

اور اسی سال ڈھاکہ میں علی گڈھ کی ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا چنانچہ ڈھاکہ میں ہی نواب سر سلیم اللہ حکیم حبیب الرحمان خان نواب وقارالملک نے ایک سیاسی جماعت بنانے کے لئے جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پہلے جلسۂ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا سنگ بنیاد پڑ گیا۔ لہذا پہلا ہی بنیادی ریزولیشن جس میں مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا گیا جو نواب ڈھاکہ نے پیش کیا تھا حکیم صاحب ہی نے اس کی تائید کی تھی۔ یہاں لیگ کے جو ممبران پنجاب کی نمائندگی کے لئے نامزد کئے گئے

ان میں حکیم صاحب کا نام بھی تھا اس طرح حکیم صاحب مسلم لیگ کے اوّلین معماروں میں سے ایک تھے اور آخر تک وہ مسلم لیگ کی پالیسی کو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کے سانچے میں ڈھالتے رہے تب تک جب تک کہ وہ کانگریس کے برابر نہ ہوگئی۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کی پہلی سیڑھی اور آغاز تھا۔

۱۹۰۶ء میں حکیم صاحب نے "یونانی" اینڈ ویدک میڈیسنز" لمٹیڈ کمپنی کے شرکار کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے حصص مدرسہ طبیہ کے حق میں فروخت کردیں۔ کمپنی کے حصہ داروں نے بلا تامل حکیم صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی بلکہ بعض نے اپنا حصہ بھی چھوڑ دیا چونکہ ہندوستانی دواخانہ بنانے کا مقصد اعلیٰ اور معیاری دواؤں کی فراہمی تھی دو سال تک دواخانہ نے عوام کی خدمت کی اس کا اعتراف کیا گیا اور اسی درمیان حکیم صاحب نے دواخانہ میں شعبۂ ادویہ کی تدوین و اصلاح کی ایک زبردست اسکیم تیار کی اور اسی غرض سے تمام مروّجہ نسخوں کی جانچ پڑتال دواؤں کے تحفظ اور تیاری کو جدید علمی تقاضوں کے مطابق بنایا گیا اور کاروباری نظام پر نظرثانی کی گئی۔ بعض قابل افراد کا تقرر اس کی انتظامیہ میں کیا۔ اس طرح دواخانہ ترقی کرنے لگا۔

۱۹۰۷ء تک حکیم صاحب کی زندگی کے بیشتر اوقات اپنے مطب یا رام پور اور علی گڑھ کے حالات میں اور سیاسی طور پر مسلم لیگ کی تحریک میں صرف ہو رہے تھے کانگریس کی تحریک میں عملی طور پر شریک نہ تھے لیکن ذہنی طور پر وہ کانگریس کی تحریک سے ہم آہنگ تھے کیونکہ ان کے خاندان کا قدیمی اخبار اکمل الاخبار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دلچسپی کانگریس سے ہوگئی تھی۔

جون اور جولائی ۱۹۰۷ء کے مہینوں میں کام کی کثرت کی وجہ سے حکیم صاحب کی صحت بہت گر گئی تھی لہٰذا عرصہ تک صحت کی خاطر کوئٹہ میں مقیم رہے۔ سال کے آخری چند ماہ زیادہ تر خیرپور اور فرید کوٹ میں بسلسلہ علاج گذرے اور دسمبر میں حکیم اجمل خان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کراچی تشریف لے گئے۔

ہندوستانی دواخانہ کی جانب سے مطمئن ہو کر ایک اور اہم ضرورت کی جانب

توجہ مبذول کی۔ ہندوستان میں جاہل و ناقابل دائیوں کی وجہ سے جو تمام اور نومولود بچوں پر کیا کیا ظلم ہوتا ہے اس درد انگیز داستان سے ہر کوئی واقف ہے۔ حکیم اجمل خان کا درد آشنا دل بھلا اس ہلاکت آفرینی کو کب تک برداشت کرتا۔ چنانچہ انھوں نے اس مصیبت عظمیٰ سے اہلِ ہند کو بچانے کے لئے ایک زنانہ طبی مدرسہ کی تحریک شروع کردی اور ایک قلیل عرصہ میں چالیس ہزار روپیہ جمع کرلیا۔ اور اس سرمایہ سے اس مدرسہ کا افتتاح دہلی کے محلہ چوڑی والان میں ایک وسیع مکان کرایہ پر لے کر زنانہ طبی مدرسہ اور زنانہ طبی شفا خانے کا انتظام کرنا شروع کردیا۔ اور پنجاب کے کے لفٹیننٹ گورنر مسٹر لوئی ڈین کی اہلیہ سے اس ادارہ کا افتتاح کرانے کی درخواست کی اور وقت مقررہ پر ڈین صاحب مع اپنی اہلیہ اور مسٹر ہمفری ڈپٹی کمشنر کے تشریف لائے۔ اس موقع پر رؤساء دہلی اور عمائدین و خواص حکیم صاحب کے موجود تھے۔ رسمِ افتتاح کے قبل کرنل اسمٰعیل خان نے (جو حکیم صاحب کے دوستوں میں تھے اور ایران میں سفیر تھے) ایک تقریر فارسی زبان میں کی۔ جس میں کرنل اسمٰعیل نے لفٹیننٹ گورنر اور ان کی لیڈی صاحبہ کا خیر مقدم کیا تھا اور زنانہ طبی ادارہ کی اہمیت وافادیت کے ذکر کے ساتھ چار ہزار روپیہ کی امداد کا اعلان بھی کیا تھا۔

لفٹیننٹ گورنر بہادر نے انگریزی میں ایک ہمدردانہ تقریر کے ساتھ حاذق الملک کے اس کام کی تعریف کی اور کہا۔

”میری حاذق الملک کے خاندان سے بہت دیرینہ واقفیت ہے جب موجودہ حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خان کے لئے کسی موزوں و مناسب خطاب کا مسئلہ گورنمنٹ آف انڈیا کے زیر غور تھا۔ میں اس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا سے سکریٹریٹ کا ایک عہدہ دار تھا۔ اور وہ شخص میں ہی ہوں۔ جس نے گورنمنٹ آف انڈیا کو مشورہ دیا تھا کہ حکیم عبدالمجید خاں کے لئے خطاب حاذق الملک ہی مناسب و موزوں ہوگا۔ جو سابق گورنمنٹ نے حکیم عبدالمجید خان کے ایک بزرگ خاندان کے لئے تجویز کیا تھا میں بہتر نہ ہوگا کہ یہ ہی شاہی خطاب حکیم عبدالمجید خان کو دیا جائے۔۔۔۔

آگے چل کر لفٹیننٹ گورنر بہادر نے کہا کہ مجھے خوشی یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں کو گورنمنٹ نے وہی خطاب حاذق الملک دیا ہے جو ان کے خاندان کا تاریخی خطاب ہے۔"

انگریزی حکومت نے بذریعۂ خطابات غلام قوم کو مزید غلام بنانے کے لئے عجیب وغریب طریقے اختیار کئے تھے۔ جن میں کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا بلکہ آمدنی ہی ہو جاتی تھی شاہی زمانہ میں خطابات کے ساتھ جاگیریں بھی عطا کی جاتی تھیں تاکہ خطاب یافتہ خطاب کے وقار کو برقرار رکھے ساتھ ہی وفاداری کا بھی مظاہرہ کرتا رہے۔ لیکن انگریزی حکومت دو چار حرفوں یا لفظوں پر ہی اکتفا کیا کرتی تھی۔ ہندوستانی خطابات میں بھی تفریق تھی۔ ابتدائی انگریزی عہد میں صرف دو چار ممتاز شخصیتیں انگریزی خطاب از قسم "سر" یا "سی۔ آئی۔ ای" سے نوازی گئیں جو براہِ راست لندن سے آتا تھا۔

البتہ گورنر جنرل کو بھی "خانصاحب" "خان بہادر" "رائے صاحب" "رائے بہادر" "راؤ صاحب" "راؤ بہادر" کو بھی عطا کرنے کا اختیار تھا۔

اور اس طرح ۱۹۰۸ء میں مدرسہ طبیہ زنانہ کا قیام عمل میں آیا۔ شفاء الملک کے خطاب یافتہ طبیب تو پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے لیکن "حاذق الملک" کا خطاب صرف حکیم اجمل خاں کے گھرانہ کے لئے مخصوص تھا۔ دلی میں حکیم رضی الدین خاں بہادر شفا الملک تھے اور حکیم حافظ محمد اجمل خان حاذق الملک۔ حکیم اجمل خان نے حکومت کا یہ خطاب ۱۹۲۰ء میں حکومت کو واپس کر دیا۔ جس کا تاریخی پس منظر یہ ہے۔

پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر اوڈائیر اور فوجی افسر جنرل ڈائر نے پہلی عالمی جنگ میں بھرپور مدد کا ہندوستانیوں کو یہ معاوضہ دیا کہ جلیانوالہ باغ میں اپنی سفاکی سے خون کی وہ ندیاں بہائیں جس سے پورا ملک لرز گیا۔ جنگ میں فتح کے غرور نے ہندوستان کو یہ خونی انعام دیا اور مسلمانانِ عالم کو خلافتِ اسلامیہ پر ضرب دے کر مشتعل کیا۔

مسلمانانِ ہند کو یہ دوسرا صدمہ پہنچا اور قومی تحریک حکومت کے خلاف شروع ہو گئی جس کا آغاز خطابات کی واپسی سے شروع ہوا چنانچہ حکیم محمد اجمل خاں

مرحوم ومغفور نے اپنا خطاب "حاذق الملک" وتمغہ "قیصرِ ہند" حکومت کو یہ کہہ کر واپس کیا کہ

"عطائے تو بہ لقائے تو"

اس کے بعد ہی وہ تحریک ترک موالات کے رہنمائے اعظم بن گئے جو مہاتما گاندھی کے زیر قیادت چلی تھی۔

چونکہ اس وقت دستور تھا کہ عوام الناس کے خطابات کے علاوہ فن دانوں عالموں اور پنڈتوں کو بھی وائسرائے کی جانب سے خطابات دیئے جاتے تھے مثلاً طبیبوں کو شفاء الملک اور حاذق الملک۔ عالموں کو شمس العلماء اور پنڈتوں کو مہا مہو پادھیائے۔

شمس العلماء کے لئے ایک سو روپیہ سالانہ کا عطیہ بھی تھا تاکہ وہ معاش کی طرف سے بے نیاز ہو کر علم کی خدمت کر سکیں۔

الغرض ان خطابات کے حصول کے سلسلے میں امیدوار لوگ جدوجہد کیا کرتے تھے اور رقمیں بھی صرف کرتے تھے جو گویا صاحب ثروت ہوتے تھے وہ کامیاب ہو جاتے تھے۔ اور مبارک وسلامت کے موقع پر وہ اور بھی صرف کیا کرتے تھے۔ بہرحال شاہی خطابات صرف کرنے کے لئے ملتے تھے اور انگریزی خطابات صرف کر کے ملتے تھے۔

خطابات کی واپسی پر حکومتِ ہند کو یہ غور کرنا پڑا کہ حکیم مرحوم پر کیا وار کیا جائے جس سے بزعم انگریز یا برطانیہ ممدوح مرحوم کو سبق ملے۔ سیاسیات ہند (انگریزی) نے یہ گویا مفید تدبیر سوچی کہ سردست حکیم صاحب کو مالی نقصان پہنچایا جائے [illegible] واحد طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ ریاستوں میں بحیثیت طبیب بلائے جانے پر پابندی لگا دی جائے تاکہ حکیم صاحب کو ایک ہزار روپیہ روز کا نقصان پہنچے۔ کیونکہ یہی اُن کی روزانہ فیس تھی۔ جو اس زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے ڈاکٹر یا طبیب کی نہیں تھی۔

غرضکہ محکمۂ سیاسیات نے ایک گشتی (سرکلر) ریاستوں کو بھیجا کہ حکیم محمد اجمل خاں دہلوی کو کوئی ریاست ہماری اجازت کے بغیر نہ بلائے۔

حکیم صاحب کی طبی خدمات سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے ان کو تمغۂ

قیصرِ ہند کا خطاب بھی حکومت نے عطا کیا تھا۔

چونکہ حکیم صاحب نے تحریک ترکِ موالات کی زبردست حمایت کی تھی اس لئے انہوں نے اپنا خطاب حاذق الملک اور قیصرِ ہند کا تمغہ حکومت کو واپس کر دیا تھا اس لئے ہندوستان کی عوام نے ان کو اپنے ایک جلسہ میں مسیح الملک کا خطاب دے کر حکیم صاحب کو ہندو مسلمانوں کی مسیحائی کا اعلان کر دیا۔ جیسا کہ مرحوم و مغفور کی طبی اور سیاسی زندگی نے ثابت کیا۔

کانگریس کی صدارت

۱۹۲۱ء کا سال ہندوستان کے لئے بڑا انقلاب انگیز تھا اس وقت تحریک ترکِ موالات اس قدر عروج پر تھی کہ حکومت انگریزی پریشان ہو گئی حکومت برطانیہ نے اس تحریک کی غیر معمولی قوت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اس بڑے مدبر کو ہندوستان بھیجا جس نے امریکہ کو محاربہ یوروپ میں شریک کر کے جرمنی کو شکست دی تھی۔ لارڈ چیمسفورڈ ابتدا میں اس تحریک سے اغماض و تضحیک کرتے رہے مگر جب اس نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو اس پر ہاتھ ڈالنے سے گھبرانے لگے۔ لارڈ ریڈنگ نے آتے ہی مقابلہ شروع کر دیا اور چالیس ہزار ہندوستانی قوم کو جیل میں بھر دیا مگر اس پر بھی یہ تحریک کم نہ ہوئی۔ ایک اور دقت یہ ہوئی کہ حکومت نے کانگریس اور خلافت کے پرجوش رضاکاروں کو خلافِ قانون قرار دیا۔

۱۹۲۱ء کے آخر میں احمد آباد میں کانگریس کا جلسہ ہوا اس جلسہ کی صدارت سی۔ آر۔ داس کو کرنی تھی مگر ان کے قید ہو جانے کی وجہ سے اجلاس کی صدارت حکیم اجمل خان کو کرنی پڑی۔ اس جلسہ میں مولانا حسرت موہانی کے آزادی کے رزولیوشن کی وجہ سے سخت اختلاف تھا مگر حکیم صاحب اور مہاتما گاندھی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے معاملہ زیادہ نہیں بڑھا۔

حکیم صاحب نے کانگریس کے فرائض صدارت انجام دینے کے بعد اپنے وقت کا بڑا حصہ اس تحریک میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۲۲ء کے شروع میں مہاتما گاندھی نے واقعہ چوراچوری کی وجہ سے باردولی میں عدم ادائے محصولات (Non-coppration) کی تحریک کو روک دیا اسکے

بعد ہی دہلی میں کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں اطراف ہند سے لیڈر آئے ہوئے تھے۔ مہاتما کے فیصلے بار دولی کی وجہ سے ایک عام مایوسی کی فضا پیدا ہوگئی تھی اور سب اسے مہلک غلطی قرار دے رہے تھے اس وقت حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کے ساتھ اس مایوسی کو دور کرنے کی سعی کی۔

بار دولی کے التوا کی وجہ سے تحریک ترک موالات میں جو ضعف پیدا ہوگیا تھا اسے حکومت نے غنیمت جانا اور مہاتما گاندھی پر مقدمہ چلا کر انھیں چھ سال کے لئے جیل میں بھیج دیا اس وقت تمام تحریک کا بار حکیم صاحب کے کندھوں پر آن پڑا۔ تحریک کی قیادت ہاتھ میں لیتے ہوئے حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کو ایک یادگار خط بھیجا اور اس میں انھیں یقین دلایا کہ وہ ان کی طرح ہندوستان کی کامیابی کے لئے عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۲۲ء میں وہ پنجاب پراونشیل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اس میں انھوں نے اہلِ پنجاب کو نصیحت کی کہ وہ آپس میں نہ جھگڑیں ورنہ خلافت اور سوراج کے مسائل حل نہ ہوں گے۔

اسی سال اس امر کی تحقیقات کے لئے کمیٹی بنائی گئی کہ اہلِ ہند پُرامن قانون شکنی کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں۔ اس کمیٹی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ شریک تھے حکیم اجمل خان اس کمیٹی کے صدر تھے۔ کمیٹی کئی ماہ تک ہندوستان میں دورہ کرتی رہی اور آخر میں اس نے ایک رپورٹ مرتب کی۔ اراکین مجلس میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا حکیم صاحب پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل نے یہ رائے دی کہ قوم پرستوں کو مسٹر داس کے پروگرام کے مطابق کونسلوں پر قبضہ کر کے حکومت کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنی چاہئے۔ ڈاکٹر انصاری اور [illegible] ممبر اس تجویز کے خلاف تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے تحریک ترک موالات کو نقصان پہنچے گا۔ اس رپورٹ کے بعد ہندوستان میں سخت خلفشار رچ گیا اور کانگریس کے دو گروہ ہوگئے۔ بعض تو داخلہ کونسل کے خلاف تھے اور بعض اس کے حامی تھے۔ ناگپور کانگریس میں بھی یہ کشمکش رہی آخر دہلی کے خاص اجلاس میں مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے یہ قضیہ طے پایا گیا اور سوراجیوں کو

داخلہ کونسل کی اجازت مل گئی۔

تحریک ترک موالات میں غیر معمولی انہماک اور صرف وقت ودماغ کی وجہ سے حکیم صاحب کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ اور وہ بہت کمزور ہو گئے اور ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ مجبور ہو کر حکیم صاحب نے مسوری ایبٹ آباد وغیرہ میں کچھ وقت صرف فرمایا اور آنکھوں کا آپریشن کرایا جس سے آرام ہوگیا۔

طبیہ کالج کا افتتاح :-

۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ نے طبیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کے بعد سے ہی حکیم صاحب نے کالج کی عمارات بنوانی شروع کردیں۔ یہ عمارات کی تعمیر پانچ چھ سال میں مکمل ہوئی اس وقت ان عمارات پر سات آٹھ لاکھ روپیہ صرف آچکا تھا۔ کالج کی عمارتیں نہایت وسیع شاندار اور خوش وضع تیار ہوئیں۔

دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خاندان مغلیہ کی شاندار عمارات کا وسیع سلسلہ ہے۔ کالج کی عمارت کو دیکھ کر بے اختیار حکیم صاحب کی بلند مرتبہ شخصیت کا احساس ہوتا ہے۔

اگر حکیم صاحب نے اور دیگر کوئی کام بھی نہ کیا ہوتا تو یہ طبیہ کالج ہی ان کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھا۔

عمارات مکمل ہو جانے کے بعد ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے اس کالج کا شاندار افتتاح کیا۔ ہندوستانی دواخانہ کو اپنے تمام خاندانی مجربات دے کر وقف کردیا اور اس کی آمدنی سے کم وبیش تمام اخراجات پورے ہوتے رہے۔

جامعہ ملیہ دہلی کے وہ امیر (وائس چانسلر) ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے اخراجات کے کفیل بھی تھے۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب اساتذہ کی تنخواہ دینے کے لئے انھیں اپنے ہیرے کی قیمتی انگوٹھی بھی فروخت کرنی پڑی۔ جامعہ ملیہ کے علاوہ مسلم یونیورسٹی ندوۃ العلماء۔ دار المصنفین اعظم گڈھ نظارۃ المعارف دہلی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ کے استحکام اور ترقی میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

آخری ایام میں حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ صحت کے ذرا اچھا ہونے پر وہ

جامعہ کے لئے بمبئی اور رنگون وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ جس طرح طبیہ کالج کو ہندوستانی دواخانہ سے مستقل آمدنی کا ذریعہ ہوگیا ہے اسی طرح جامعہ ملیہ کے لئے کوئی سبیل نکال دیں مگر افسوس ہے کہ ان کی موت نے اس اسکیم اور آرزو کو پورا نہیں ہونے دیا۔

طبّی کانفرنس رام پور:۔

اوائل ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب نے طبّی کانفرنس رام پور میں عظیم الشان جلسہ کرایا نواب رام پور اس جلسہ کے صدر تھے۔ حکیم صاحب نے اس جلسہ میں بھی اطبّاء کو اصلاح و تجدید کی جانب متوجہ کیا اور نصاب پر نظر ثانی کے لئے دہلی لکھنؤ ولاہور میں تین کمیٹیاں بنائیں۔

آخری ایّام:۔

دسمبر ۱۹۲۷ء کے پہلے ہفتہ میں وہ رام پور تشریف لے گئے مگر اس مرتبہ وہاں ان کو قلب کے سات شدید دورے پڑے جس سے وہ مزید ناتواں ہو گئے۔ دہلی واپس آئے تو کمر میں چک آ گئی۔ جس سے تین روز تک شدید تکلیف رہی درد کی۔ اس حال میں بھی ہمت کا یہ حال تھا کہ روزمرّہ کے مشاغل انجام دیتے رہے بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کمیٹی کے جلسہ میں بھی شریک ہوتے۔

انہی دنوں امیر افغانستان بمبئی تشریف لا رہے تھے۔ جامعہ ملیہ اور خلافت کمیٹی کی طرف سے امیر صاحب کی خدمت میں ایڈریس پیش کرنے کا پروگرام پہلے پاس ہو چکا تھا اور اس غرض سے حکیم صاحب کا بمبئی جانا ضروری تھا چنانچہ سفر کی تیاری شروع ہو چکی تھی مگر شدید درد کی وجہ سے دو روز کی تاخیر ہوئی تیسرے دن درد کے باوجود حکیم صاحب نے سفر کا ارادہ کیا۔ چند احباب نے سفر نہ کرنے کا بھی مشورہ دیا لیکن حکیم صاحب بمبئی تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب اس وقت بہت کمزور ہو چکے تھے۔ کئی روز سے انھوں نے غذا بھی نہیں کھائی تھی۔ کمر کے درد کی وجہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے اور

گاڑی میں بھی وہ دو آدمیوں کے سہارا دینے سے بیٹھ سکتے تھے۔

بمبئی میں دو روز تک قیام پذیر رہے انھوں نے جامعہ ملیہ کی طرف سے امیر صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور مختلف تقریبات میں شریک ہوئے۔ پھر وہاں سے جامعہ ملیہ کے لئے ریاست پالن پور میں تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ انھیں دو مرتبہ درد کا دورہ ہوا مگر بدستور مشاغل میں مصروف رہے اور ۲۵ دسمبر کو دہلی لوٹ آئے۔

۲۵ دسمبر کی صبح کو حکیم صاحب بمبئی سے دہلی تشریف لائے۔ صبح ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک ڈاک دیکھتے رہے جو اس دوران میں بڑی تعداد میں اکٹھی ہو چکی تھی پھر ان مریضوں کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے جو دور دراز سے آئے ہوئے تھے۔ شام کو ۷ بجے واپس آئے اور مطب میں بیٹھ گئے اور شب کو ۹ بجے تک آخری مطب فرمایا ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی سے رام پور تشریف لے گئے رام پور میں طبیعت خراب رہی۔ صرف ایک انڈے کی زردی غذا کرتے رہے۔ ۲۸ کی شام کو حسب معمول بلیرڈ کھیلتے رہے گیارہ بجے تک نواب رام پور سے باتیں کرتے رہے پھر آکر سو رہے۔ بارہ بجے نواب صاحب نے یاد کیا۔ خدمت گار نے بیدار کر کے عرض کیا کہ سرکار یاد فرماتے ہیں۔ چونکہ طبیعت خراب تھی۔ اس لئے فرمایا کہ چوبدار سے کہہ دو کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ چوبدار ابھی واپس نہیں پہنچا تھا کہ خود نواب صاحب تشریف لے آئے۔ حکیم صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک نواب صاحب بعض اہم معاملات کے متعلق مشورہ فرماتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں حکیم صاحب تکلیف محسوس کرتے رہے مگر غیر معمولی ضبط کی وجہ سے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

وفات :۔

پونے دو بجے نواب صاحب تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ چیف سکریٹری صاحب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے ان کو کچھ ضروری باتوں کے لئے اپنے پاس ٹھہرا لیا کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب نے قلب پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور گہرا سانس لیا۔ چیف سکریٹری صاحب نے گھبرا کر کہا کہ حکیم صاحب کیا تکلیف ہے۔ فرمانے لگے کہ قلب کے مقام پر تکلیف ہے۔ سکریٹری صاحب نے کہا آپ آرام فرمائیں میں صبح حاضر

ہو جاؤں گا۔ مگر حکیم صاحب نے ان کو پھر روک لیا۔ پانچ سات منٹ کے بعد پھر سخت دورہ ہوا اور حکیم صاحب کے منہ سے خفیف سی چیخ نکلی اور فرمایا کہ جلد ڈاکٹر عبدالحکیم خاں صاحب کو بلایئے۔ چیف سکریٹری صاحب نے خدمت گار کو ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لئے بھیجا اور دوسرے خدمت گار کی مدد سے حکیم صاحب کو مسہری پر لٹا دیا۔ کچھ وقفہ کے بعد پھر دورہ ہوا۔ فرمایا کہ گرم پانی لاؤ مگر ڈاکٹر اور گرم پانی کے آنے سے پہلے شب کو دو بجے تین ہچکیاں لیں اور دہلی کا یہ بے تاج بادشاہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

ہز ہائی نس نواب صاحب کو اطلاع ہوئی تو وہ تشریف لائے اور بے اختیار ہو کر فرمایا کہ حکیم صاحب نہیں مرے میں مر گیا۔

صبح کو نواب صاحب رام پور کے کئی تار دہلی پہونچے کہ حکیم صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ایک تہلکہ مچ گیا سارے شہر دہلی میں۔ ۲ بجے میت موٹر کے ذریعہ دہلی پہونچی۔ ۴ بجے جنازہ آخری آرام گاہ کی جانب روانہ ہوا۔ جنازہ کے ہمراہ مسلمان ہندو۔ سکھ پارسی اور عیسائی غرضکہ ہر فرقہ کے لوگ موجود تھے اور ہزارہا مخلوق ساتھ تھی۔ چاندنی چوک سے شریف منزل تک اس قدر ہجوم تھا کہ گزرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ہر آنکھ اشک بار تھی۔

دہلی کی جامع مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ بعض احباب کی رائے تھی کہ مصلح قوم سرسید کی طرح حکیم صاحب کی تدفین بھی ان کی محبوب اور عظیم طبی درسگاہ طبیہ کالج قرول باغ میں عمل میں آئے لیکن متعلقین کی منشاء اور حسب دستور حکیم صاحب کے جسد خاکی کی تدفین حضرت خواجہ سید حسن رسولنما قدس سرہٗ جن کا مزار پہاڑ گنج سے آگے ہے اور جہاں حکیم صاحب کے والد۔ دونوں بھائی مدفون ہیں عمل میں آئی۔

جب حکیم صاحب کے انتقال کی خبر دہلی سے باہر دیگر مقامات پہونچی تو ہر جگہ شدید رنج و غم کا اظہار کیا گیا کلکتہ اور لاہور میں مسلم لیگ کے ایسے وقت میں اجلاس ہو رہے تھے ان اجلاس میں تعزیت کی قرارداد پاس ہو کر اجلاس ملتوی ہو گئے۔

تمام ہندوستان نے ایک عرصۂ دراز تک اپنے محبوب لیڈر کا غم منایا۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو گا جہاں حکیم صاحب کے لئے تعزیتی جلسہ یا قرارداد نہ پاس کی گئی ہو۔

تمام انگریزی، اردو، نیز ہندی کے اخبارات نے اس حادثہ پر مضامین سپرد قلم کئے۔ اس وقت دہلی میں موجود وائسرائے لارڈ اروِن اور سابقہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ حکومتِ افغانستان۔ حکومت مصر۔ سلطان مسقط اور متعدد والیان ریاست نے ہمدردی کے پیغامات ہندوستان نیز ہندوستان سے باہر یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایران وغیرہ کے معروف لوگوں کے تعزیت نامے ملے اور جلسے بھی بعض مقام پر ہوئے۔

اسی موقع پر مدراس میں کانگریس کا جلسہ ختم ہی ہوا تھا۔ جیسے وہاں خبر پہونچی تو صدر کانگریس ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کہا کہ۔

"اس قدر کامیابی کے بعد اس خبر نے میرے دل کو توڑ دیا ہے۔"

گاندھی جی نے اپنے مضمون میں لکھا۔

"حکیم اجمل خان کی موت نے مجھ سے صرف ایک دانشور اور ثابت قدم تحریک کا رہی کو نہیں چھین لیا بلکہ میں نے ایک ایسا دوست بھی کھو دیا ہے کہ جس پر میں ضرورت کے وقت بھرپور اعتماد کر سکتا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے معاملہ میں وہ میرے مشیر اور رہنما تھے۔ وہ انسانی فطرت کو خوب پہچانتے تھے اور اسی صلاحیت نے انھیں صحیح قوتِ فیصلہ عطا کی تھی۔ وہ ایک خیالی قسم کے انسان نہ تھے بلکہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی پوری قوت رکھتے تھے۔"

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ۔

"جو لوگ حکیم اجمل خان سے اپنے مرض کا نسخہ لینا چاہتے ہیں جو اپنی ملازمت کی سفارش کے خواہاں ہیں جنھیں اپنے عزیز کی شادی کے لیے روپیہ درکار ہے۔ جن بیواؤں کی روٹی ان کی توجہ سے چلتی تھی جن یتیموں اور ناداروں کی تعلیم کے لیے ان کے خزانہ سے رقم ملتی تھی ان کی تعداد سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہے ان کا اجمل خاں رخصت ہو گیا مگر طبِ قدیم کا مجدد اور طبی تعلیم کا رہنما آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

پسماندگان :-

حکیم صاحب نے اپنے انتقال کے بعد دو دختران اور ایک صاحبزادے کے ساتھ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں عقیدت مندان چھوڑے تھے۔

تصانیف :-

حکیم محمد اجمل خاں کی مصروف سیاسی و سماجی زندگی نے ان کو تصنیف و تالیف کا موقع کم دیا تاہم فن طب میں جو کچھ بھی لکھا وہ اہم ہے۔
قیامِ رام پور کے زمانے میں حکیم صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں چونکہ تصنیف و تالیف کا شوق ابتدا سے ہی تھا لہٰذا زمانۂ تعلیم ہی میں ایک رسالہ عربی میں القول المرغوب فی الماء المشروب تحریر کیا جسے بعد میں کسی قدر ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مجلۂ طبیہ میں شائع کرا دیا تھا اور اس رسالہ میں پانی کے جزو بدن نہ ہونے پر بحث کی گئی ہے۔
۹۶ - ۱۸۹۵ء میں جب ہندوستان میں طاعون کی وبا پھیلی تو اردو میں ایک محققانہ رسالہ لکھا جس میں طاعون کے تاریخی حالات اسباب اور علامات درج کیے تھے اور آخر میں علاج کے طریقے نہایت تفصیل سے تحریر کئے تھے۔ یہ رسالہ کئی بار چھپا۔ اس کے علاوہ التحفۃ الحامدیہ فی الضاعۃ الکلیہ الفاظ العان فی اغالیط غایۃ الاستحسان اوراقِ مظہرہ اور البیان الحسن بشرح المعجون المسمیٰ، اکیرالدین شائع کیں۔ ان میں سے التحفۃ الحامدیہ میں کشتہ جات کے استعمال کا جواز اور ان کے فوائد پر بحث کرتے ہوئے ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو کشتہ جات کے استعمال پر معترض ہیں۔ الفاظ الغمسان میں حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو انھوں نے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے فتولئے عدم حسن جوہر دماغ پر کئے تھے۔ البیان الحسن میں علاج الامراض کی معجون لنا کے معمہ کو نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا ہے۔ اوراقِ مظہرہ میں بعض طبی استفسارات کے جوابات فصاحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ البیان الحسن کا ایک حصہ فارسی میں ہے۔ جس سے حکیم صاحب کی فارسی دانی پر روشنی پڑتی ہے۔

رسالہ فی ترکیب الادویہ و استخراج اللغات الطبیہ۔ اس میں مرکبات کی تیاری
اور مفردات کی پہچان کی تفصیل موجود ہے۔ شرح اسباب کا حاشیہ بھی لکھا تھا۔
اگرچہ حکیم صاحب کی تمام تالیفات ان کے زمانۂ شباب کی ہیں تاہم ان میں حسن
استنباط۔ اجتہاد فکر اور اعتدال رائے کے وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو ایک
بہترین تصنیف کے ضروری ارکان ہیں۔

حاذق :۔

حکیم صاحب کی یہ طبی تصنیف دراصل طب یونانی کا خلاصہ اور خاندان شریفی کا
مکمل دستورالعلاج ہے اس کتاب میں حکیم محمود خاں. حکیم عبدالمجید خان اور خود طبیب
اعظم حکیم اجمل خاں کے خاص الخاص نسخے اور طریقہ ہائے علاج درج کر دیئے گئے
ہیں حکیم صاحب کا نقطۂ نظر طب میں بہت وسیع تھا وہ شفا بخش نسخوں کو سینہ
بہ سینہ پوشیدہ رکھنے کی مشرقی روائیات کے خلاف تھے۔
حاذق بلاشبہ طبی تجربات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

شعروشاعری :۔

حکیم اجمل خان کو شعروشاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ شیدا تخلص فرماتے تھے۔
چونکہ قدرت نے شاعری کی خداداد صلاحیت بخشی تھی اس لئے کسی استاد کی ضرورت نہ
پڑی۔ حکیم صاحب کی کوٹھی پر ادیبوں اور شاعروں کا ہجوم رہتا تھا۔ سائل دہلوی
اور بیتاب دہلوی دونوں بھائی شبانہ محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی رات گئے
تک شعروسخن کی بزم آرائی رہتی۔ حکیم صاحب نے زندگی کے مختلف ادوار میں اور
خاص طور پر قیام رام پور کے زمانے میں کبھی کبھی اشعار کہے ہیں۔ کبھی کبھی سفر میں بھی
شعر کہتے تھے۔ جب سیاسی اور قومی سرگرمیاں زیادہ بڑھ گئیں۔ تو شعر گوئی کا سلسلہ
گویا بالکل ترک ہو گیا۔ تاہم جو کچھ تھا وہ بھی محفوظ نہ رہا۔ اور کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو
گیا۔
ان کے کلام کا کچھ حصہ دیوان شیدا کے نام سے ۱۹۲۶ء میں پہلی بار ٹائپ میں

جرمنی سے شائع ہوا تھا دوبارہ یہ مارچ ۱۹۶۶ء میں ہندوستانی دوا خانہ کی جانب سے چھپا تھا۔ جرمنی والے نسخہ کی طباعت ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوشش کا نتیجہ تھی۔
اس شعری مجموعہ کا مقدمہ مشہور — ادیب اور حکیم صاحب کے سکریٹری قاضی عبدالغفار نے یکم نومبر ۱۹۲۵ء کو تحریر کیا ہے۔
غزل کا نمایاں پہلو عشقیہ اشعار ہوتے ہیں۔ شاعر کا دل جب تک سوز عشق اور اندرونی شوق والتہاب کا شکار نہ ہو۔ وہ ایک معیاری شاعری نہیں کر سکتا ہے۔
کہتے ہیں۔

چرچا ہمارا عشق نے کیوں جا بجا کیا — دل اس کو دے دیا تو بھلا کیا بُرا کیا
وہ خواب ناز میں تھے مرا دیدۂ نیاز — دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا

گم کردہ راہ آتے ہیں وہ آج میرے گھر
آہ میری آہ نیم شبی تو نے کیا کیا

اگر عرض تمنا کا کسی دن امتحاں ہوگا — جبیں ہوگی کسی کی اور کسی کا آستاں ہوگا
آخر لبوں تک آ ہی گئی آرزوئے دل — کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروئے دل

یہ دیوان چھوٹی تقطیع کے سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی کی $\frac{۴۳}{۴۲۷}$ اشعار اور اردو کی $\frac{۲۶}{۱۲۶۷}$ اشعار غزلیں ہیں۔
دیوان شیدا کا انتساب خواجہ عبدالمجید شیخ الجامعہ اور اساتذہ جامعہ دہلی کے نام ہے۔ دیوان میں دو باب ہیں۔

معرکے:۔

حکیم صاحب کے لاتعداد ایسے واقعات ہیں جو تاریخی ہیں اور ان کے علاج ومعالجہ کی ویسے کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ چند واقعات درج ذیل ہیں۔
دہلی کے قریب ایک رئیس کی بیوی نے حکیم صاحب کو نبض دکھائی اور حکیم صاحب سے اپنی کیفیت بیان کی۔ مریضہ حاملہ تھی۔ لیکن حکیم صاحب نے فرمایا کہ یہ حمل نہیں بلکہ رحم میں رسولی پیدا ہوگئی ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کو دکھایا گیا سب نے حمل قرار دیا۔ بالآخر گیارہ ماہ کی مدت گزر جانے پر آپریشن کرایا گیا۔ آپریشن میں رسولی برآمد ہوئی۔

نواح بلگرام ضلع ہردوئی کی رہنے والی ایک مریضہ بغرض علاج دہلی وارد ہوئیں ان کو سنگ مدارہ یعنی پتہ میں پتھری کی شکایت تھی۔ تمام بدن پر پھوڑے پیدا ہو گئے تھے اور بدن کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں تیرگی اور پیشاب سیاہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں اور دوسرے ڈاکٹروں وطبیبوں کا مدت تک علاج کرایا گیا۔ لیکن مطلق فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں نے بالاتفاق آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت علاج کی نہیں ہے۔ چونکہ مریضہ کمزور تھی اس لئے آپریشن بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مریضہ سب طرف سے مایوس ہو کر دہلی آگئیں۔ اور یہاں دو ماہ تک حکیم اجمل خاں کے زیر علاج رہیں اور بالکل تندرست ہو کر واپس گئیں۔ واپسی پر لکھنؤ میں سول سرجن صاحب کو پھر دکھایا تو ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا مرض بغیر آپریشن کے دور ہو گیا۔

اسی طرح حکیم صاحب کے پیرس اور لندن کے کئی واقعات ہیں جو انتہائی تعجب خیز ہیں۔

حکیم صاحب غرباء کا خاص طور پر علاج زیادہ دلچسپی سے کرتے تھے۔ ایک بہت ہی غریب مریض آپ کے پاس آیا جس کو کئی دنوں سے خون کا پیشاب آرہا تھا اور وہ بہت پریشان تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ بازار سے ملتانی مٹی لے کر آؤ۔ ایک تولہ روزانہ صبح وشام بھگو کر وچھان کر پی لیا کرو۔ اپنی معمولی دوا کے استعمال سے مریض چند ہی دنوں میں مرض سے نجات پا گیا۔

لقمان الملک شاہی طبیب حکیم نابینا

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم

۱۲۸۷ــــ۱۳۶۰ھ   ۱۸۶۸   ۱۹۴۱ء

تاریخ میں ایسی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جو اپنے علم و فن ۔ کمال و ہنر کی بدولت ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ جاوید ہوگئی ہیں ۔ ایسی ہی ہستیوں میں ایک مایہ ناز طبیب کی ہستی حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم کی بھی ہے ۔

نظام قدرت ہے کہ انسان و جانوروں کے اندر قوت مدافعت موجود ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ اپنی دیکھ ریکھ حفاظت ۔ نشوونما کرتا ہے اور یہ تمام افعال اس میں موجود قوتوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں ۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی ایک قوت کمزور ہو جاتی ہے یا ختم و فنا ہو جاتی ہے تو دوسری قوتیں زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً قوت باصرہ اگر کمزور یا ختم ہوگئی ہے تو دیگر قوتیں جیسے قوتِ لامسہ ۔ قوتِ ذائقہ ۔ قوتِ شامہ ۔ قوتِ سامعہ قوتِ باصرہ ۔ قوتِ مدرکہ ۔ قوتِ محرکہ ۔ قوتِ مغیرہ ۔ قوتِ غازیہ ۔ قوتِ نامیہ یہاں تک کہ قوتِ حیات بڑھ جاتی ہے ۔

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم ہمارے ملک کے حد درجہ ماہر ۔ صاحبِ علم ۔ بہت بڑے نباض اور نہایت حاذق و مشہور حکیم ہوئے ہیں ۔ سابق ریاست نظام آباد کے طبیبِ خاص یا معالجِ خصوصی کی حیثیت سے اور فنِ طب میں اپنی خلافت بلاغت و قابلِ طبیب ہونے کی بنا پر ان کو سارے ہندوستان میں شہرت اور عزت حاصل تھی ۔

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم تحریک آزادی کے اہم ستون و سپاہی
باکمال سرجن ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ایم۔ ڈی۔ ایم۔ ایس (لندن) کے برادر تھے۔
حکیم نابینا کے برادرِ خورد ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہندوستان کی وہ مایہ ناز
ہستی ہے جو ماہر سرجن ہونے کے باوجود طبی طریقۂ علاج کو بڑی قدر و عزت کی
نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اور جب کوئی ایسا مریض ان کے دواخانے میں آجاتا جس کے
بارے میں وہ یہ سمجھتے کہ یہ مریض یونانی طبی طریقۂ علاج سے ٹھیک ہو سکتا ہے تو بلا وجہ
اس کو کبھی بھی آپریشن کی میز پر نہ لٹاتے تھے۔ اور ایسے مریضوں کو وہ اپنے بڑے
بھائی حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم یا انگلستان کے ملاقاتی جنگ آزادی
کے سپاہی اور ماہر طبیب حاذق مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں بھیج دیا
کرتے تھے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کہا کرتے تھے کہ سرجن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ صرف
انتہائی مجبوری کی حالت میں اپنا نشتر استعمال کرے اور جب اچھے اچھے یا فزیشین
بے بس ہو کر جواب دے دیں تو پھر سرجن کو دیانت داری کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہئے
یعنی ایک باکمال معالج یا فزیشین کا قدم جہاں جاکر رک جاتا ہے۔ وہاں سے پھر ایک
ماہر سرجن اپنا قدم اٹھاتا ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بڑے وسیع النظر اور عالی ظرف
انسان تھے۔ وہ اپنے پیشہ کی بڑائی اس بات میں سمجھتے تھے کہ دوسرے علوم و فنون کا
بھی پاس و لحاظ رکھا جائے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وسعتِ قلبی اور بالغ نظری کا اندازہ اس حقیقت
سے لگایا جا سکتا ہے کہ۔

ہندوستان کے عروس البلاد شہر بمبئی میں آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن
کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے ایک تجویز منظور کرائی جس میں
یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ طب یونانی اور فن آیورویدیر بھرپور توجہ دیکر ان طبوں
کی حوصلہ افزائی کرے۔ کیونکہ یہ طریقۂ علاج اس ملک کے اہم طریقۂ علاج ہیں اور
ہندوستان میں دیسی طریقۂ علاج کے لئے میدان کافی سازگار ہے کیونکہ دیسی
طریقۂ علاج میں دیسی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ جو اندرون ملک پیدا ہوتی ہیں

اور ملک کی ہی بنی ہوتی ہیں۔ اور ہمارے ملک کے باشندوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں۔ مزید برآں یہ سب سے بڑھ کر ان دیسی دواؤں کے مخالف اثرات بالکل نہیں ہوتے ہیں۔

خاندان :-

حکیم عبدالوہاب انصاری حکیم نابینا کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان۔ علم، عزت اور دولت کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ سلاطین مغلیہ کے عہد میں اس خاندان کے افراد اپنے اعلیٰ کارناموں کی وجہ سے خاص امتیازات سے سرفراز ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کے جدِ امجد شیخ شہاب الدین احمد انصاری بعہد شاہ عالم غازی منصب ہفت ہزاری و جاگیر سے سرفراز ہوئے تھے اور یہ جاگیر آج تک ان کے خاندان کی وراثت میں چلی آرہی ہے۔

آپ کے والدِ ماجد الحاج حکیم عبدالرحمٰن انصاری جو بہت مشہور طبیب اور صاحبِ کمال عالم گذرے ہیں ساتھ میں سیاح ممالک اسلامیہ اور طبیب حاذق ہونے کے علاوہ شیخِ طریقت بھی تھے۔ جو بعد انتقال حیدرآباد ہی میں درگاہ حضرت نورالدین شاہ صاحب قدس سرہٗ میں مدفون ہیں۔

پیدائش :-

حکیم نابینا بمقام یوسف پور ضلع غازی پور میں اسی ممتاز، منفرد و اعلیٰ گھرانے میں تولد ہوئے تھے۔ آپ کی دونوں چشم بعارضہ چیچک اوائل عمری میں خراب ہو گئی تھیں۔ جس کے بعد خدا نے بصارت لے کر بصیرت عطا کر دی تھی۔

تعلیم و تربیت :-

ابتدائی تعلیم گھر کے ادبی و تعلیمی ماحول میں شروع ہوئی۔ ان کے والد نے بچہ کی ذہنی صلاحیت، قوتِ ادراک، تحصیلِ علم کی جستجو میں انہماک کو دیکھ کر محلہ کے اچھے

اچھے علماء و فضلاء سے تعلیم دلائی۔ طالب علم کو نئے افق کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر والد قبلہ حکیم عبدالرحمٰن نے ایسے لائق و فائق بچے کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسی حالت میں دارالعلوم دیوبند میں آپ نے عربی میں مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور فارسی کی تعلیم مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کر کے عربی فارسی و حدیث کی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اپنے مقصدِ حیات علمِ طب اپنے والد سے حاصل کرنے میں رجوع ہوئے۔

اس کو حکیم نابینا نے خود بھی بیان کیا ہے۔ اپنی گراں قدر تصنیف اسرارِ شریانیہ مع : مجرباتِ انصاریہ میں لکھتے ہیں۔

اضعف العباد بعون اللہ تحریر لسانِ عرب میں ماہر اور تجربہ کار ہے۔ علوم درسیہ ادب میں بھی بڑے بڑے کملاء اور ادباء مثل مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی و مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے فیضیاب ہے لیکن مادری زبان اہلِ ہند کی چونکہ اُردو ہو گئی ہے لہٰذا مضامین اقرب الی الفہم ہونے کے لئے اُردو میں تحریر کیا۔ جیسا کہ ہادیٔ مطلق نے اشارہ وانہ لفی ذبر الاولین میں فرمایا ہے۔ علوم مضامین ہیں نہ لسان۔

والدِ قبلہ سے تعلیم طب حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے مشہور خانوادہ طب و علم خاندان شریفی کے مسلم الثبوت و ماہر تعلیم طب حکیم محمود خاں و حکیم عبدالمجید خان سے تعلیم طب کی تکمیل کی اور آخر الذکر سے سند حاصل کی۔

خدمات :۔

تعلیم سے فراغت کر کے اپنے والد ماجد کے آبائی دوا خانے میں مطب کرنا شروع کیا۔ ور تھوڑے ہی عرصے میں چہار جانب شہرہ ہو گیا۔ والیٔ ریاست حیدر آباد ہز ہائی نس میر محبوب علی خان (نظام دکن نے) ان کی حذاقت و حکمت کا چرچا سنکر اس جواہر پارہ کو اپنی ریاست میں مطب کرنے اور خدمتِ خلق کے ذریعہ عوام الناس کو فائدہ پہنچانے کے لئے دعوت نامہ اور سرکاری وظیفہ کی پیشکش کی۔ یہاں حکیم صاحب المعروف بہ حکیم نابینا۔ کافی عرصے تک شاہی طبیب کے

عہدہ پر مقیم رہے پہلے حیدر آباد جا کر حضرت غفران مکان کے عہد میں چالیس سال
تک بمقام پتھر گلی مطب کرنا شروع کیا تھا جہاں آپ کو بہت مقبولیت ملی اور جب
عالیجاہ حضرت نظام حیدر آباد کے طبیب خاص مقرر ہو گئے تو بحیثیت شاہی معالج
ڈیوڑھی مبارک میں عوام کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے طبی خدمات انجام دیں۔
میر محبوب علی خان والئ ریاست حیدر آباد کے وہاں کوئی بچہ نہ ہوتا تھا۔
اور نواب حیدر آباد جانشین تخت کے لئے بہت پریشان اور متفکر رہتے تھے۔
نواب صاحب کے وہاں ان کے علاج و معالجہ سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے
نواب حیدر آباد کی حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا پر بہت نوازشیں
تھیں۔ یہاں تک کہ ریاست کے نظم و نسق میں بھی نواب صاحب حکیم صاحب سے
صلاح و مشورہ لیتے رہتے تھے۔
میر محبوب علی خان کے جانشین میر عثمان علی خان سے نظریاتی و ذہنی اختلاف
ہو جانے کے باعث حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا حیدر آباد چھوڑ کر
ہندوستان آ گئے۔ سب سے پہلے پونا میں پھر عروس البلاد شہر بمبئی میں اور آخر
میں دہلی میں مطب کرنا شروع کیا۔
قیام دہلی میں ۱۹۲۵ء میں جامع مسجد کے سامنے جہاں پر اب ہوٹل تاج ہے
ایک پوری بلڈنگ خرید کر دواخانہ مطب و قیام گاہ کی تعمیر کرائی۔
حکیم صاحب ماہر نباض ہونے کے ساتھ ساتھ مدفون پوشیدہ خزانوں کے
بتانے میں ملکہ رکھتے تھے جس کی بنا پر ارباب علم و ہنر کا اندازہ تھا کہ حکیم عبدالوہاب
علم رمل و جفر کے ساتھ ساتھ علم نجوم کے ماہر تھے جب کہ عوام یہ تاثر رکھتے تھے
کہ حکیم صاحب کا اتنے ماہر نباض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے قبضہ میں
کوئی جن ہے اور حکیم نابینا عامل ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی نباضی کا بھرم قائم ہے
حکیم صاحب نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد کے سامنے والے
مکان میں ایک خزانہ پوشیدہ ہے دوسرے دن حکیم نابینا صاحب نے وہ نیا تعمیر شدہ
مکان کھدوانا شروع کر دیا تھا۔
ان کی نباضی کا شہرہ سن کر دور دراز سے علاج کے لئے مرضاء اُن کی خدمت

میں حاضر ہوتے تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں صرف شفا ہی عطا نہ کی تھی بلکہ فن نباضی کا وہ جوہر عطا کیا تھا کہ وہ مریضوں سے کچھ پوچھے بغیر محض نبض سے ان کے امراض کی تشخیص کر لیتے تھے اور وہ تشخیص ایسی صحیح ہوتی تھی کہ مریض اپنا مرض اور واقعات سن کر حیران رہ جاتے تھے۔

اردو ادب کے درخشاں ستارے خواجہ حسن نظامی اوّل نے ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کے روزنامچے میں حکیم عبدالوہاب انصاری حکیم نابینا کا ایک واقعۂ نبض تحریر کیا جس سے حکیم صاحب کی نباضی کا معترف اور حکماء کے فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

" وہ حکیم نابینا صاحب مہاراج سرکشن پرشاد کے بچوں کی نبض دیکھنے کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ میں (خواجہ حسن نظامی) حیران ہو گیا کہ رانیوں اور بیگمات اور بچوں کی نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کسی کا حال نہیں پوچھا، خود ہی ہر بیمار کی مفصّل کیفیت نبض پر ہاتھ رکھ کر بتا دی اور ہر بیمار نے تصدیق کی کہ بیشک یہی حال ہے۔ اس وقت مہاراجہ نے ایک قصّہ بیان کیا کہ ایک دفعہ حیدر آباد میں ان حکیم صاحب کو میں نے اپنے گھر پر بلایا۔ رانی صاحبہ کی نبض دکھانی تھی مگر بجائے رانی صاحبہ کے میں نے نبض دکھا دی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا: "یہ نبض تو مہاراج کی ہے۔" میں نے (خواجہ حسن نظامی) اپنی زندگی میں ایسا کمال کسی طبیب میں نہیں دیکھا۔

خصوصیاتِ دواخانہ:-

اطبّاء اور حکماء عام طور پر مریض کو مرض کے ازالہ کے لئے بالعموم پینے کے لئے قدحے دیا کرتے ہیں۔ لیکن حکیم نابینا نے طبّی طریقۂ علاج میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کی دوائیاں مقدار میں بیحد قلیل ہوتی تھیں۔ مگر قدحوں سے زیادہ مؤثر۔

مشہور تاریخ داں اور مترجم ضیاء الدین برنی فرماتے ہیں کہ " ان کے صاحبزادوں کے ساتھ میرے دوستانہ روابط تھے وہ (حکیم صاحب) مجھے بھی اپنے بچوں جیسا سمجھتے تھے۔ مجھے متعدد دفعہ ان سے علاج کرانے کے مواقع ملے اور ہر دفعہ میں ان کی غیر معمولی حذاقت کا اثر لے کر آیا۔ انھوں نے مجھ سے کبھی دواء کی قیمت

نہیں لی اور ہمیشہ قیمتی سے قیمتی دوائیں اپنے پاس سے عنایت فرمائیں۔ ان کی تیار کردہ ادویہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ صحیح اجزاء پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ موتیوں کے بجائے ان میں سیپ ڈال دیئے گئے ہوں یا ان کے اوزان میں کمی کر دی گئی ہو۔

خواجہ حسن نظامی نے انھیں "لقمان الملک" کا خطاب دے رکھا تھا۔

ان کے مطب میں کل چالیس یا پچاس دوائیں ہوتی تھیں اور وہ سب ان کے صندوقچہ میں بند رہتی تھیں۔ مرضاء کو یقین تھا کہ اگر حکیم صاحب نے اپنے صندوقچہ سے دوا دے دی تو شفاء یقینی ہے۔ عام طور پر اس صندوقچہ میں کشتہ جات رہتے تھے۔

اکثر ایسا ہوا کہ عطاروں سے کشتہ بنانے اور بنا کر دکھانے کو بتایا۔ حسب ہدایت عطار کشتہ بنا کر لایا حکیم صاحب نے ہاتھ لگایا اور ہدایت کی کہ کشتہ میں یہ کمی ہے۔ کبھی کبھی ان عطاروں نے بغرض امتحان پھر وہی کشتہ سابقہ حالات میں لا کر دے دیا اور کہا کہ تیار ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب نے دیکھتے ہی کہا کہ ابھی سابقہ حالت پر ہے۔ حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا ہونے کے باوجود فن کشتہ سازی میں ماہر تھے اور اسی علم کی بدولت کیمیا بنانے کا شوق تھا۔ بقول شوکت علی فہمی مدیر دین دنیا دہلی اس شوق کی جلا کے لئے حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم نے سونا بنانے کے لئے جرمنی سے کوئی کیمیکل بھی منگایا تھا۔

حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا نے ایک عمارت طبیہ بلڈنگ کے نام سے ایک لاکھ روپے کے مصارف سے مدینہ فنڈ کے لئے تعمیر و وقف کی جس کی رسم افتتاح ۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کو حضرت اقدس و اعلیٰ [illegible] وسلطنت نے اپنے دست مبارک سے ادا فرمائے اور حکیم نابینا کے فرزند اکبر حکیم عبدالحی انصاری ناشر اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ نے سپاس نامہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

طریقۂ علاج:۔

آپ اپنے مریض کو پہلے ایک ہفتہ کی دوا بلا قیمت دیتے تھے پھر فائدہ ہونے پر

سابقہ اور موجودہ ہفتہ کی دوا کی قیمت لے لیتے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری کے عطارِ خصوصی بنام غالب تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم صاحب موصوف کے برادرِ خورد جب انگلستان سے واپس آئے تو ان کے عطار غالب صاحب کے لئے ایک جوڑ جوتا بھی لائے تھے۔ غالب صاحب وہ نیا جوتا پہن کر حکیم نابینا صاحب کے ساتھ کسی دیگر ریاست میں مریض دیکھنے گئے۔ راستہ میں جوتے نے کاٹ لیا۔ متعدد علاج ہندی یونانی و انگریزی کرنے پر بھی فائدہ نہ ہونے کی صورت میں کلکتہ بغرض علاج لے جائے گئے۔ وہاں بھی افاقہ نہ ہونے کی صورت میں غالب صاحب کی ٹانگ کاٹی گئی اور وہیں اسی عارضہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

حکیم صاحب موصوف صبح ۸ ½ بجے سے ۱۲ ½ بجے تک مطب کرتے تھے اور اس کے بعد کسی بھی مریض کو کسی بھی صورت سے نہ دیکھتے تھے۔

فیس :۔

عام طور پر مریض سے اس کی حیثیت کے مطابق دس روپے، سو روپے اور ہزار روپے فیس تھی۔

انتقال سے کچھ عرصہ قبل آپ نے کناٹ پیلس میں ایک وسیع و عریض بلڈنگ تعمیر کرائی تھی جہاں آپ کا آخری وقت گذرا۔

آپ نے مسلمان نرسوں کی تعلیم کے لئے گراں قدر پچیس ہزار روپے کا عطیہ بھی دیا تھا۔

مذہبی رجحانات :۔

حکیم نابینا صاحب مذہبی معاملے میں پکے تھے۔ بقول ضیاء الدین احمد برنی "وہ بہت مذہبی آدمی تھے ان کا خالی وقت درود و وظائف میں صرف ہوتا تھا" ۱۳۵۷ھ میں بغرض حج بیت اللہ شریف تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے وظائف پڑھنے کے لئے ایک ہزار دانہ تسبیح بھی لائے تھے انھوں نے کناٹ پیلیس

نئی دہلی میں جو جائداد بنوائی تھی اس کی آمدنی کا ایک حصہ (مدینہ بازار کا) مدینہ کے مساکین کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی ہندو اور سکھا گردی میں اس مکان کو بھی لوٹ لیا گیا۔ حالانکہ وہاں تحریکِ آزادی کے امام اور کانگریسی رہنما ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے حکیم عبدالحی رہتے اور مطب کرتے تھے۔
غرضکہ حکیم صاحب حد درجہ متقی اور دیندار و پرہیزگار شخص تھے۔ اور آپ حاجی، حافظ، محدث ہونے کے علاوہ طبی دنیا میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔

تصانیف:-

آپ نے موضوعِ "نبض" (جس پر آپ کو خدا نے خداداد صلاحیت ودیعت فرمائی تھی) پر اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ جو آپ کے غیر معمولی حافظہ اور مجربات دواخانہ و مطب نیز رموز نبض اور نباضی پر مشتمل ہے۔
آپ ماہر نباض کے طور پر طبی دنیا میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اور آپ (حکیم نابینا) کی نبض شناسی کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے۔

وفات:-

آپ کا انتقال پُر ملال بمقامِ دہلی ۷ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء کو ہوا۔ اور ہزارہا اشخاص کی دعاؤں کے ساتھ انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مرحوم حکیم صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے ان میں خدمت الناس کی غیر معمولی لگن تھی۔ زبان پر ہمیشہ اللہ اور رسولؐ کا ذکر رہتا تھا۔

پسماندگان:-

الحاج حکیم عبدالرحمان صاحب انصاری کے ۳ فرزند اکبر تھے۔
(۱) حکیم عبدالوہاب انصاری جن کا تذکرہ درجِ بالا ہے۔

(۲) ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۔ یہ حکیم صاحب مغفور کے برادر خورد ۔ ہندوستان کے مشہور و معروف ڈاکٹر اور کانگریس پارٹی کے روح رواں تھے ۔ حکیم اجمل خاں کے تمام سیاسی سماجی اور طبی کاموں میں شریک کار تھے ۔ چنانچہ طبیہ کالج دہلی کی داغ بیل ڈالنے میں آپ کا سب سے بڑا حصہ تھا ۔

(۳) عبدالرزاق انصاری یہ نواب رضا جنگ مرحوم کے سررشتہ مال میں ترقی کرتے ہوئے اورنگ آباد کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے ۔

حکیم عبدالوہاب انصاری نے تین صاحبزادے اپنے بعد اپنی یادگار چھوڑے تھے ۔

حکیم محمد عبدالحئی انصاری جو حکیم صاحب کے ساتھ اور بعد میں حکیم کی مسند پر بیٹھے ۔

حکیم عبدالقادر جو تقسیم سے پہلے لاہور چلے گئے تھے ۔

حکیم مولوی عبدالغنی المعروف خسرو شاہ نظامی جو حیدرآباد میں دواخانہ و مطب کرنے لگے تھے ۔

حکیم عبدالوہاب انصاری کے انتقال پر نہ صرف طبی دنیا میں بلکہ ہندوستان بھر میں افسوس کیا گیا ۔

ادباء و شعراء نے نذرانۂ عقیدت پیش کیے اور قطعات تاریخ وفات و مادہ تاریخ رحلت تحریر اور شائع کیا ۔

پیشگاہ حضرت ظل سبحانی سے اخبار صبح دکن مورخہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو حسب ذیل مادہ تاریخ شائع کیا ۔

انتقال حکیم عبدالوہاب انصاری دہلوی ۔

ما حکیم موصوف را خوب می دانستیم کہ او فی الحقیقت در فن طب ید طولیٰ می داشت و ہم محدث و زاہد و متقی بود بخصوص در فن نباضی مشہور بود بہر حال بزبان ماست ۔

مادۂ تاریخ رحلت

بہ دار طب علی دبو سینا رسیدہ	ہماں جائیکہ نابینا رسیدہ
مریضان ایں نعم البدل گفتند عثمان	چہ ماتم بینا اے دار رسیدہ

(درمیان ما) ۱۹۴۱ء

رائے استادِ جلیل :۔

یہ لاجواب مادّہ تاریخ نکلا ہے حکیم صاحب کے خاندان کو اس پر ناز کرنا چاہیئے۔
از صبح دکن مورخہ یکم تینیر ۱۲۵ ف

طبّی معرکے :۔

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا نے حیدر آباد، پونا، بمبئی اور دہلی میں ایسے ایسے معرکے کے علاج کیئے ہیں کہ اگر وہ سب معرض تحریر میں آجائیں تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔ ان کی بدولت ہر جگہ یونانی طب کا نام بہت روشن ہوا حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی وفات سے ہندوستان میں طب یونانی کا آفتاب غروب ہوگیا۔

اردو شاعری کی آبرو علامہ اقبالؒ کو بھی ایک بار مصاۃ الکلیہ (گردے کی پتھری) کا عارضہ ہوگیا۔ ہندوستان کی نامی گرامی شخصیتیں حکیم صاحب کے علاج سے مستفید ہو چکی تھیں اور حکیم صاحب موصوف کے صندوقچے کے علاج کا بڑا شہرہ تھا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں آپریشن کے سوا دوسرا کوئی طریق کار نہ تھا۔ اور آپریشن کے لئے بھی یہ طے پایا کہ ویانا (آسٹریا) میں ہو تو بہتر ہے۔ علاّمہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کے چند احباب کے مشوروں سے یہ طے پایا کہ حکیم صاحب کا علاج شروع کیا جائے۔
علاّمہ اقبالؔ حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوئے اور اپنی نبض دکھائی، حکیم نابینا کی دوربین نظروں نے سمجھ لیا کہ کثرت سے شےنوشی اور گوشت خوری کے سبب سے گردہ میں (URIC ACID) کے جماؤ سے پتھر ہو گئے ہیں دوسرے روز حکیم صاحب نے قارورہ کا بغور معائنہ فرمایا اور علاج شروع کیا گیا۔ حکیم صاحب نے پتھری نکالنے والی دوائیں استعمال کرائیں اور اپنے صندوقچۂ خاص سے کشتہ حجر الیہود عقربی (بچھو والا) دینا شروع کیا۔ خدا کے فضل سے علامہ ڈاکٹر سر اقبال کی ساری پتھریاں نکل گئیں دوبارہ ایکسرے میں نظر نہ آئیں حکیم صاحب نے درج بالا پرہیز کی ہدایت کی اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ہمیشہ ہمیش کے لئے اس مرض سے نجات پائی۔

اپنی آخری بیماری میں بھی ڈاکٹر اقبال حکیم صاحب کے زیر علاج تھے۔ جب کہ ڈاکٹری علاج سے ڈاکٹروں کو ان کی حیات کی کوئی امید نہ تھی۔ علامہ اقبال کے پسماندگان بھی مایوس ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں حکیم صاحب نے اپنے صندوقچے کی خاص دوا، روح الذہب اور روح الفضا (جو بتدریج سونے اور چاندی کے محلول کا مرکب ہوتا تھا) کی چند خوراک علامہ اقبال کی خدمت میں بھیجی۔

تیز اثر دوا نے اپنا کام خدا کی مرضی سے حسب اُمید کیا اور مریض صحتیاب ہو گیا۔ علامہ اقبال نے حکیم صاحب کی دوا روح الذہب کے بارے میں ۱۹۳۷ء میں حسبِ ذیل قطعہ لکھ کر روانہ کیا بطور اظہار تشکر۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکرِ خاکی مرا
رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرا ذوقِ طلب

- ایک شعر یوں بھی ہے۔

ہے دو روحوں کا نشیمن یہ تنِ خاکی مرا
ایک میں ہے سوز و مستی ایک میں ہے تاب و تب

ایک، جو اللہ نے بخشی ہے مجھے صبحِ ازل — دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی روح الذہب

ایسے تھے پہلے زمانہ کے قابل ذہن اور ولی اللہ صفت حکیم اور یہ تھے ان کے کمال۔

اسی لئے اطباء قدیم کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ علم طب کے اسرار و رموزات کتابی شکل میں عام نہ کئے جائیں۔ اور ان کو سینہ بہ سینہ منتقل کیا جاتا رہے۔ تاکہ یہ علم با صلاحیت۔ خلیق۔ عمیم۔ اور فہم مستقیم ہی کو ملے۔ اسی لئے اکثر سلفِ روحانی اس طرز طریقہ کو کامل طور پر حاصل کیا کرتے تھے۔

سقراط و بقراط اور افلاطون وغیرہ سب کے سب موحد اور بڑے پیمانے پر مجاہدہ باطنی کیا کرتے تھے بسا اوقات افلاطون دور آبادی سے عشق الٰہی میں غرق ہو کر گریہ و زاری اور آہ و بکار اس قدر بشدت آواز کیا کرتے تھے کہ ایک ایک میل دور تک ان کے رونے اور خدا کے حضور میں گڑگڑانے کی آواز جاتی تھی۔ اور ان کے شاگردِ رشید اس آواز کی وجہ سے اُن کو تلاش کر لیا کرتے تھے۔

غرضکہ انسان کی بینائی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر بصارت نہ بھی ہو تو بصیرت ضرور ہونا چاہیئے۔

حکیم حاجی قاضی سیّد کرم حسین قادری

۱۲۸۷ھ بابت ۱۸۷۰ء — جون ۱۹۲۵ء

تصوف و سلسلۂ عالیہ قادریہ کا نقیب

خاندان :۔

مسلمانوں کے عہد عروج واقتدار میں ایک نئے اُفق کی تلاش شوق تبلیغ اور اس خطۂ ارض کی مخصوص کشش کی وجہ سے وسط ایشیاء اور اس کے قریبی علاقوں سے جوق در جوق قافلے ہندوستان آئے۔ ان واردان ہندوستان میں حکیم سیّد کرم کے اجداد بھی تھے جنھوں نے سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں چنگیز خاں کے کشت وخون نیز غارت گری سے گھبرا کر اور لُٹ پُھنک کر سرزمین ہند کا رُخ صرف اس لئے کیا تھا کہ یہاں ایک وسیع اور پائیدار نہ صرف اسلامی حکومت قائم تھی بلکہ ہر چہار جانب امن وامان تھا بلکہ زرخیزی بھی تھی۔

ان کے اجداد ہمیشہ سے دارالقضاء، افتا اور محتسب کے عہدوں پر فائز رہے تھے اس لئے قاضی کے خطاب سے عوامی طور پر پہچانے جانے لگے۔ ان کے والد قاضی سید امداد علی ۱۸۰۹ء کو قصبہ ساکرس میں پیدا ہوئے۔ جب حکیم سید کرم علی کے دادا کی عمر ۶ سال تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی بنا پر حکیم کرم علی کے والد نے ساکرس ضلع گڑگاؤں کو (جو اب ہریانہ میں ہے) چھوڑ کر تجارہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حکیم کرم علی کے والد قاضی امداد علی نے ناگپور میں مہاراجہ بھونسلے کے وہاں فوجی خدمات انجام دیں۔ وہاں ان کو عزیزوں کا رسالہ مع نقارہ

ستّو سواروں پر مشتمل تھا۔ حاکم وقت کے ساتھ تنازعہ ہو جانے پر حکیم کرم علی کے والد اپنے احباب و عیال کے ساتھ تجارہ واپس آ گئے۔

پیدائش :-

۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء میں تجارہ جو ریاست الور راجستھان کا ایک حصہ تھا۔ وہاں سادات گھرانے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کا اصل نام سید محمد سلیم الدین تھا لیکن گھریلو نام جو ان کی عمۃ محترمہ صدیق النساء بنت غلام عسکری نے (آقائے نامدار کے بھانجے حضرت حسینؑ کے نام پر رکھا تھا کیونکہ حضورؐ کو اپنی آل سے جتنی محبت تھی وہ اظہر من الشمس ہے) کرم حسین رکھا۔ بھوپال سے حافظ غلام احمد فروغیؔ نے جن سے ان کے خاندان کے قریبی مراسم تھے انھوں نے ایک تاریخی نام بلند اختر تجویز کیا تھا۔ اور واقعی خدا کا کرم ایسا ہوا کہ یہ مانند ستارہ دنیا میں چمکے۔

حکیم سید کرم کی پیدائش کے وقت غدر کا پرآشوب دور دورہ گذر چکا تھا جس کی بنا پر عظیم تبدیلیاں رو نما ہو گئی تھیں۔ خصوصًا مسلمانوں کے ذہنوں میں ان دنوں میں عظیم انقلاب کے دوررس اثرات مرتب ہونے لگے تھے۔ ان کے والد کی پیرانہ سالی اور نومولود کی صغر سنی۔ گردش دوراں۔ وقت کی نزاکت کا احساس۔ ان تمام عناصر نے مل کر کرم حسین کی خصوصی تعلیم و تربیت پر ان کے والدین کو مجبور کیا کہ وہ اپنے خاندان کے واحد چراغ کو تعلیم کے زیور سے مزیّن کریں۔

تعلیم و تربیت :-

دستور زمانہ کے مطابق سید کرم حسین کی تعلیم و تربیت کا آغاز بھی گھر سے ہی ہوا اور بعمر ۴ سال ۴ ماہ ۴ دن رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔ چونکہ ان کے والد ماجد خود بھی عربی و فارسی کے استاذ کامل تھے اور درس و تدریس سے سابقہ تھا جس کی بنا پر فارسی کے ابتدائی اسباق والد گرامی سے پڑھے۔ اس کے بعد تجارہ کے دوسرے اساتذہ سے فارسی و عربی کی مزید تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کے شفیق استاد مولوی حسین الدین مدرس راج مدرسہ تجارہ تھے۔ جن کی تربیت اور حسنِ اخلاق سے سید کرم حسین نے

بہت کچھ سیکھا تھا۔ تجارہ کے سرکاری مدرسہ میں درسی کتب کی تکمیل کی۔
دورانِ تعلیم جب ان کی عمر بمشکل ۹ سال کی تھی کہ ان کے والد قاضی سید امداد علی داغ مفارقت دے گئے۔ ایسے مشکل دور میں شفیق ماں فیاض النساء نے جس طرح ان کی تعلیم و تربیت اور تعلیم دلائی وہ نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ انھیں کا حصہ تھا۔
ان کی والدہ ماجدہ فیاض النساء کو شادی کے صرف دس سال بعد شوہر کی جدائی کا حادثہ جانکاہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس غم و اندوہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی بصارت جاتی رہی۔ بصارت سے ضرور محروم ہو گئی تھیں لیکن بصیرت کی دولت سے مالا مال تھیں۔ فہم و فراست، سلیقہ مندی نیز حسنِ اخلاق کا نمونہ تھیں ان کی سوجھ بوجھ کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔ انھوں نے کرم حسین کی شادی کے کچھ عرصہ بعد بہو کو سینے کے لئے کپڑا دیا۔ کپڑا سی کر جب وہ خوش دامن صاحبہ کے پاس لے گئیں تو انھوں نے سیون اور تُرپن کی تعریف کی لیکن کہا کہ۔ بہو تم اُلٹا کپڑا سی لائی ہو۔ بہو (حکیم النساء) نے بیان کیا ہے کہ وہ کپڑا ایسا تھا جس کے اُلٹے سیدھے کی کوئی تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں جانب سے کپڑا ایک سا معلوم ہوتا تھا۔ خوشدامن صاحبہ کے کہنے پر جب غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ انھوں نے بجا فرمایا ہے۔
بچوں کی تربیت جس اخلاق سے ماں نے کی وہ لائقِ تعریف ہے۔ حکیم کرم حسین اپنی اوج و رفعت کو دیکھ کر کہتے تھے کہ آج ان کو جو قدر و منزلت اور بامِ عروج حاصل ہوا ہے وہ سب ان کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔
۱۸۹۷ء میں جب حکیم کرم حسین مطب کرنے لگے تھے تو ایک صاحب حیثیت مریض ان کے دوا خانے میں ہاتھی پر سوار آیا تو انھوں نے اپنی والدہ سے اس مریض کا ذکر کیا تو انھوں نے دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ "بیٹا خدا نے چاہا تو خود تمہارے یہاں ہاتھی ہوں گے۔" باری تعالیٰ نے ماں کی یہ دعا قبول کی اور واقعی کرم حسین کے یہاں ہاتھی جھولے۔ اسی طرح جب کرم حسین اپنی والدہ سے مطب میں آنے والے مریضوں اور حاکمِ وقت کے بارے میں بتاتے تو والدہ عرض کرتیں کہ یہ کیا ہے۔ اس سے بھی بڑے آئیں گے۔ خدا نے فیاض النساء جیسی صابرہ و شاکرہ ماں کی یہ دعا بھی قبول کی اور بڑے سے بڑے حاکم مریض بن کر دوا خانے میں آئے۔ جن میں انگریز وزیر اعظم

اور والئ ریاست ہز ہائی نس مہاراج جے سنگھ کا نام نامی اسم گرامی قابل ذکر ہے اور یہ سب مادرِ گرامی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

طبی تعلیم :-

چھ سال کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد بعمر ۱۴ سال ان کی اعلیٰ و ارفع تعلیم کا مسئلہ ماں کے پیش نظر تھا۔ ایسے وقت میں ایک جانب سرسید اپنے رفقاء کے ساتھ قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے تھے تو دوسری جانب قدیم اخبارات کے مسلمان انگریزی تعلیم و تربیت کے خلاف محاذ آرائی کیے ہوئے تھے۔ ایسے پر آشوب دور میں ماں نے کرم حسین کو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے طب کی تعلیم دلانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ ان کے اس فیصلہ میں خاندان کے دیگر بزرگوں کا مشورہ تو داخل ہی تھا، کرم حسین کے نانا حکیم غلام حسین کا مشورہ بھی پیش پیش تھا جو ایک کامل و حاذق طبیب تھے۔ یہ فیصلہ ایسے وقت میں ماں نے کیا تھا جب کہ شوہر کے انتقال کو صرف پانچ سال کا وقفہ گذرا تھا۔ کرم حسین اپنے خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ تھے گھر میں گذر بسر کے لئے بفضل تعالیٰ اتنا کچھ تھا کہ آسانی سے فکر معاش کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن ماں نے عزم و حوصلہ اور دور اندیشی کو بروئے کار لاتے ہوئے تیزی سے بدلتی ہوئی انقلابی تبدیلیوں کے پیش نظر سیکڑوں سال سے ورثہ میں مل رہی قصبہ ساکرس کی قضاۃ پر قناعت نہ کرتے ہوئے بیٹے کو طبی تعلیم کے لئے میرٹھ عازم سفر کیا۔ جہاں یہ مشہور و معروف طبیب حکیم محمد حسن حاذق کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ قیافہ شناس اور لائق و فائق استاد نے شاگرد کے چہرے پر ذکاوت و ذہانت کے آثار نمایاں پائے۔ کمال ہمدردی سے گلے لگایا اور ان کی ذہنی و فنی تربیت میں پورے انہماک سے اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ حکیم محمد حسن سے طبی درسیات کی تکمیل اور فنی رموز و نکات کے علاوہ مطب اور نسخہ نویسی کی تعلیم حکیم بلدیو سہائے سے حاصل کی۔ میرٹھ اس زمانے میں۔ طبی و علمی اعتبار سے حکیم محمد حسن حاذق اور عملی و معالجاتی اعتبار سے حکیم بلدیو سہائے کو خاص امتیاز اور ملکہ حاصل تھا جن کے مطب میں دور دور سے طلباء نسخہ نویسی کی مشق کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

ایک باکمال شاگرد کی طرح حکیم سید کرم نے بھی اپنے استاد اعلیٰ حکیم بلدیو سہائے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے۔

ے حکیم علو قدر بلدیو سنگھ — سرِ چرخ پر ان کا ذہن رسا

نہیں ہے ثریا تک خلق میں — نہیں ان کا ہمسر کوئی دوسرا

تجارہ میں فن خطاطی کا علم چونکہ سیکھ چکے تھے۔ جس کی جلا میرٹھ میں ہوئی۔ وہاں پر نستعلیق اور نسخ دونوں میں کمال حاصل کیا جو ان کی آئندہ زندگی کے لئے ترقی کا زینہ ثابت ہوئی۔ ان کی تحریریں خطاطی کا بیش قیمت ورثہ معلوم ہوتی ہیں میرٹھ میں ان کے استاد طب حکیم محمد حسن حاذق جو ایک کثیر کتب کے مصنف تھے ان کی بیشتر کتب کی کتابت ربطِ تعلق اور عقیدت کی بنا پر خود حکیم کرم حسین نے کی۔ یہ بڑے شغف ایثار اور ذوقِ علم کی علامت تھی۔ حکیم کرم حسین نے اپنے استاد طب کی جن کتب کی کتابت کی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) معجون حیات — مطبوعہ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء۔

(۲) ترجمہ افسرائی — " — شعبان ۱۳۰۹ھ مطابق مارچ ۱۸۹۲ء

(۳) توضیح الادویہ — " — ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء

(۴) ترجمہ قرابادین اعظم — مطبوعہ ۱۸۹۴ء

ان کی کتابت شدہ کتاب معجونِ حیات میں آپ کی کتابت کی شان میں مشہور شاعر گوہر علی میرٹھی نے مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں۔

ہیں رئیس تجارہ قاضی جی — کاتب اس کے بشان وما شوکت

نام نامی کرم حسین اُن کا — نیک خو۔ خوب رو وخوب صفت

رشک یوسف لکھوں اگر اُن کو — تو زلیخا کو آئے گی غیرت

کیا ہی خوشخط لکھا ہے اور واضح

آپ نے نسخہ یہ بصد صحت

توضیح الادویہ جس کی کتابت بھی کرم حسین نے کی تھی ان کی کتابت کی شان میں درج ذیل الفاظ تحریر کئے گئے ہیں جو کتاب میں شامل ہے۔

از سرمایۂ بلاغت پیرایۂ فصاحت گوہر درج فضل و کمال فرخندہ سیرت

حمیدہ خصال مقبول دارین قاضی حکیم سید کرم حسین صاحب ناطق رئیس تجارہ متعلقہ ریاست الور سلمہ اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح قرابا دین کے ترجمہ میں جو ان کے استادِ محترم کی تحریر کردہ تھی۔ اس کتاب میں بھی اسی طرح ان کی کتابت کی تعریف کی گئی ہے۔

میرٹھ میں حکیم سید کرم حسین کا ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۴ء تک یعنی دس سال قیام رہا۔ درسیاتِ طب کی تعلیم کے علاوہ وہاں انھوں نے چند سال طبیب کے فرائض بھی انجام دیئے۔ خصوصاً منشی اعجاز علی کے دواخانے میں کچھ عرصہ انھوں نے مریضوں کی بھی دیکھ ریکھ کی۔

میرٹھ میں دس سال قیام اور مطب کے نتیجہ میں وہاں ان کا ایک وسیع حلقہ بن گیا تھا جس میں بے تکلف احباب کے علاوہ مرضاء کی بھی ایک خاصی تعداد تھی۔ طبی محافل اور علمی وادبی مجالس میں ان کی شرکت برابر رہتی تھی۔ عام شاعروں سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن مخصوص شعری نشستوں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ نہ صرف کلام سنتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ سیرت اور دیگر موضوعات پر مذہبی تقریروں کی وجہ سے انھیں مذہبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کے میرٹھ کے خاص دوستوں میں منشی احتشام علی قابلِ ذکر ہیں۔

میرٹھ میں حکیم صاحب سے مستقل قیام کا اصرار رہا خود ان کا ایسا ہی ارادہ تھا لیکن والدہ نیز دیگر اعزاء کی فرمائش کے آگے یہ خیال ترک کر کے ۱۸۹۴ء میں وطن واپس آ گئے۔ اور تجارہ میں مطب شروع کیا۔ تشخیص و تجویز پر بلکہ اور دستِ شفا کی وجہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شہرت آس پاس کے علاقوں تک پھیل گئی اور [illegible] ان کا مطب مرجع مرضاء بن گیا۔

حکیم کرم حسین کے مزاج میں نفاست اور پاکیزگی حد درجہ تھی ملازمت کی بندشیں انھیں کہاں گوارہ ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا ملازمت کی جو بھی پیشکش انھیں ملیں وہ انھوں نے قبول نہیں کیں۔ حافظ غلام احمد فروغی جنھوں نے ان کا نام بھوپال سے بلند اختر تجویز کر کے روانہ کیا تھا۔ انھوں نے بھوپال کے صفیہ طبابت میں بحیثیت سرکاری طبیب کی پیش کش کی۔ حکیم سید کرم علی ۱۸۹۵ء میں بھوپال گئے ضرور لیکن چند یوم قیام کر کے

حافظ غلام احمد سے معذرت کر کے واپس آ گئے کیونکہ ان کو اپنے فن پر بھرپور اعتماد اور ان کے بلند حوصلہ کا یہی تقاضا تھا جسے انھوں نے طبی تعلیم کے دوران منتہائے نظر بنا رکھا تھا۔

تجارہ میں مطب میں نمایاں کامیابی ملنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں انھوں نے پہلے دواخانہ حکیم کرم حسین پھر دواخانہ شفاء الامراض کے نام سے دواخانہ کھولا۔ یہ دواخانہ انھوں نے تازہ معیاری اور عمدہ دوائیں مریضوں کو فراہم کرنے کی غرض سے کھولا تھا۔ اس دواخانہ کی تیار کردہ دوائیں۔ آسام، بنگال، بہار، پورٹ بلیر، سیلون، عدن، ہانگ کانگ، نیپال، کلکتہ، حیدرآباد، سندھ ودکن کراچی سکھر بلوچستان میں کوئٹہ تپین۔ افغانستان میں بنوں۔ کوہاٹ۔ پشاور۔ دروش۔ مالاکنڈ۔ چترال اور ریاستوں میں جموں وکشمیر۔ پونچھ۔ پٹیالہ۔ بہاول پور۔ گوالیہ۔ بنارس۔ جے پور۔ ٹونک۔ باندہ۔ بڑودہ۔ بھوپال۔ کوچین وغیرہ جایا کرتی تھیں۔

کھیرلی ریلوے اسٹیشن جو تجارہ سے سترہ میل دور تھا پھر بھی مریض کافی تعداد میں آتے تھے۔ قصبہ تجارہ میں حالانکہ ایک ڈاکخانہ پہلے بھی تھا لیکن چونکہ حکیم سید کرم حسین کے دواخانہ کا کام اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ مزید ایک ڈاکخانہ کی ضرورت ہوئی۔ مسٹر بولڈ سپرنٹنڈنٹ جو بعد میں سرکل پوسٹ ماسٹر جنرل ہوئے دواخانے آئے اور ان حضرات کی سفارش پر ایک نیا ڈاک خانہ دواخانہ کے کام کے لئے دواخانے میں ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا جو آزادی کے وقت تک رہا۔

حکیم سید کرم حسین اپنے وقت کے نامور اطبا، ہند سے جیسے شفاء الملک حکیم حافظ اجمل خان۔ شفاء الملک حکیم عبدالرشید۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی حکیم حافظ عبدالولی لکھنؤ کے حکیم مولوی احمد حسین۔ الہ آباد کے حکیم امیر سنگھ۔ دہلی کے بابائے طب حکیم فرید احمد عباسی۔ شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں پٹیالہ۔ حکیم احمد الدین۔ حکیم فیروز الدین۔ حکیم غلام محی الدین لاہور کے۔ حکیم عبدالقادر خان افسر الاطبا، بھوپال اور حکیم سید عبدالحمید (مرجع البحرین) بھوپال کے شفاء الملک حکیم حبیب اللہ خان اجمیر۔ شفاء الملک حکیم عبدالحسیب دریا آبادی۔ حکیم فقیر محمد چشتی لاہور حکیم ہادی رضا لکھنؤ حکیم وہاج الحق۔ حکیم خواجہ کمال الدین لکھنؤ۔

حکیم محمد حسن قریشی۔ حکیم محمد شریف لاہور۔ حکیم غلام کبریا خان۔ حکیم محمد الیاس خان۔ حکیم محمد فضل الرحمان۔ حکیم محمد کبیر الدین۔ حکیم مصطفیٰ خان۔ میرٹھ۔ حکیم حبیب الرحمٰن خان ڈھاکہ (طبیب نواب صاحب ڈھاکہ) سے قریبی و دیرینہ مراسم تھے۔

بوقت انتقال حکیم اجمل خان سے خصوصی تعلق کی بنا پر ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب کے انتقال پُر ملال پر جو وفات کی تاریخ نکالی وہ مندرجہ ذیل ہے اور اس قطعہ کو انھوں نے اپنے رسالہ "مسیحائے زماں" کی اشاعت میں مضمون کے ساتھ درج کیا تھا۔

ے ناطق سے تاریخ ہوا طالب و ہیجاں
ہاتف کی ندا آئی کہو الغفر لہٗ ۱۳۴۶ھ

ان کو جتنا کتب کی خریداری کا شوق تھا اتنا ہی کتب بینی کا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں دس ہزار نادر کتب کا ذخیرہ تھا۔ اور اس ذخیرے میں کئی سو قیمتی مخطوطات کے علاوہ تصوف۔ مذہبیات۔ تاریخ۔ تذکرہ۔ فرامین شاہی۔ علماء و مشائخ کی بعض نادر تحریریں۔ پرانے جرائد۔ نیز رسائل وغیرہ کے فائل تھے۔

شعری و ادبی ذوق:۔

اطباء کا تعلق نہ صرف شعر و ادب سے بلکہ سیاست، سماج، مذہب نیز ادب کے ساتھ قریبی رہا ہے۔ یہ روایت ہر دور کے اطباء کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے یا پھر ہند کے۔

حکیم سید کرم حسین جو اطباء قدیم کی طبی، تہذیبی اور ادبی روایات [illegible] تھے۔ شعر و ادب کا بڑا نکھرا ذوق رکھتے تھے۔ اور ناطق تخلص [illegible] نثار علی خان صدق میرٹھی ان کے استاد سخن تھے۔ حکیم سید کرم حسین نے استاد کی شاعرانہ خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

ے کہ اس فن میں شاگرد ہوں، ہوں صدق کا

قیام میرٹھ میں جہاں علمی و ادبی نہ صرف ماحول تھا بلکہ شعر و ادب کا مرکز تھا حکیم سید کرم حسین نے وہاں خاصی تعداد میں غزلیں اور نظمیں کہیں۔ لیکن تجارہ واپسی پر

تصوف کی جانب مرجان۔ تصنیف وتالیف کا شوق نیز مصروفیاتِ دواخانہ اس شوق میں مانع ہوتے گئے۔

حکیم کرم حسین نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں بڑی شعریت، سادگی روانگی اور رعنائی موجود ہے۔ اگر ان کی نظموں کا صوری ومعنوی محاسن کا تجزیہ کیا جائے تو بآسانی ان کے مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے وہ سیدھے سادے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر کمال قدرت کے ساتھ ادا کر دیتے ہیں۔ نظمیں پورے حسن، التزام کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ اور ایک اچھی نظم کے لئے جتنی چیزیں درکار ہوتی ہیں، کلام ناطق میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

ایک طویل نظم میں فضائلِ حج کا بیان جس طرح کیا ہے وہ کتنا خوش کن ہے۔

ہو اگر مقدور زادِ راہ کا — فرض تم پر حج ہے بیت اللہ کا
یوں ہے ارشادِ رسولِ کردگار — حج نہیں کرتے جو مومن مالدار
مالداری کچھ نہ پہنچائے گی سود — حشر میں ہوں گے نصاریٰ و یہود
زور و زر جب دے دیا اللہ نے — پھر رہیں محروم جو اس فرض سے
کافروں میں ان کا ہوتا ہے شمول — ڈال ایسی زندگی پر خاک و دھول
زندگی دو روزہ کی ہے دوستو! — موت سر پر ہے گھڑی غافل نہ ہو
یوں کہا حضرت عمرؓ نے تین بار — حج ادا کرتے نہیں جو مالدار
چاہتا ہوں حکم دوں ان کے لئے — جزیہ دیں وہ کافروں کے طور سے
ایسے لوگوں کو اگر دیکھوں ابھی — گھر جلا دوں ہے قسم اللہ کی
بعض اصحابِ رسولِ کبریا — سخت نفرت ان سے رکھتے تھے سدا
بعض بے زر مفلسوں کا ہے یہ حال — چل دیئے کر کے توکل کا خیال
نہ سواری ہے نہ زادِ راہ ہے — کہتے ہیں رزاق بس اللہ ہے
منع قرآن میں خدا نے کر دیا — منع کرتے ہیں حبیبِ کبریا

مت رکھو ایسے توکل پر قدم
دوسروں پر بار بننا ہے ستم

غرض زبان و بیان، اور لب ولہجہ کے اعتبار سے ان کے ادب پارے اچھے

دور کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو حسین سانچہ میں ڈھالنے اور ادب و شاعری کے گلشن کو بھونڈے اور بھدے الفاظ سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف مواقع پر قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔

ہیں میرے استاد مسیحائے زماں — وصف میں جس کے زبان نطق لال
نام سے ان کے شفا کو ہے فروغ — اپنے پیشے ہی نہیں صاحب کمال
اگر محمد یوسف تاج حسن — نام روشن ان کا ہے بے قیل و قال
ایسی کچھ اردو کی توضیح کی — تھا بہت مشکل اگر کیجئے خیال

بس اگر تاریخ کا پوچھے کوئی
کہئیے ناطق نسخہ لا مثل و مثال ۱۸۹۳ء

مصرعہ کی چستی اور کلام کی پختگی ایک ایک شعر سے نمایاں ہے۔ تیسرے شعر میں مصنف کا نام (محمد حسن) اور چوتھے شعر میں کتاب کا نام (توضیح الاردو) کس خوب صورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

حکیم صاحب نے صوفیانہ اور مذہبی خیالات کے علاوہ طبی مسائل کو بھی نظم کی زبان میں قلم بند کیا ہے۔

یہ نسخہ پرانا جو اعظم کا ہے — فرابادین ہے نام اس کا بڑا
زبان عجم میں تھا جلوہ فگن — بڑا رہتا تھا ہند میں مدعا
خیال آگیا بیٹھے بیٹھے جو کچھ — کیا اردو کر کے تجزا و درس کو بتا
فصاحت ٹپکتی ہے ہر لفظ سے — ہر اک فقرہ آئینہ ہے صفا
کیا سخت مشکل کو کیسا سہل تر — مترجم کے حق میں کریں ہم دعا
خیال آیا تاریخ اس کی لکھوں — کہ اس فن میں شاید ہو جلوہ نما

ندا آئی ناطق سے تاریخ سے
مسیحا نے اعظم کو زندہ کیا
۱۳۱۲ھ

ایک منظوم طبی رسالہ نصاب الطب جو ان کی اور ان کے استاذ طب کی محنت کا

ثمرہ ہے۔ اس میں ادویہ مفردہ کے مترادف نام اور طبی اصطلاحات بیان کی گئی ہیں۔

گوکھرو ہندی تازی ہے خسک ۔۔۔ فارسی خارِ خسک بے شبہ و شک
کہتے ہیں آلو بخارا جس کو سب ۔۔۔ بولتے اجاص ہیں اس کو عرب
عشر تازی، ہندی ہے آکھ اور مدار ۔۔۔ فارسی میں جانِ خرک اے ہوشیار
ہے اٹنگن ابجرہ اے رشکِ ماہ ۔۔۔ دیسی اجوائن سمجھ تو نانخواہ
ہے میاں جوہی چنبیلی یاسمین ۔۔۔ وردِ احمر ہے گل سرخ اے حسین
سیوتی نسرین ہے اے باخبر ۔۔۔ کیوڑہ کو جان کاذی اور کدر

اسی طرح کتاب اصول صحت میں امراض کا علاج نظم کیا گیا ہے۔

پوست خشخاش رکھ لے بیس کر ۔۔۔ ہے تپ لرزہ کو نافع بیشتر
نیم ماشہ نیم ماشہ تین بار ۔۔۔ فاصلہ سے تو کھلا قبل از بخار
پھر تپ لرزہ نہ آئے گی کبھی ۔۔۔ دے پلا تھوڑا سا آب گرم بھی

شاگرد:۔

یوں تو حکیم سید کرم حسین کے شاگردان رشید کی فہرست طویل ہے لیکن شعر و ادب کے میدان میں فرحت علی فرحت نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔

مذہبی رجحانات:۔

مخصوص دیسی ماحول میں پرورش کا حکیم صاحب کی نشو و نما پر گہرا اثر پڑا۔ اوائل عمری میں عام طور پر مذہبی اعمال کی جانب زیادہ توجہ نہیں ہوتی اور اکثر کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔ حکیم سید کرم حسین عمر کے اس ابتدائی دور میں بھی فرائض کی انجام دہی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اعمالِ صالحہ اور نماز کی پابندی کا خاص اہتمام فرماتے۔ اس کی ادائیگی میں انھیں ایک خاص سرور حاصل ہوتا تھا۔ وقت سے پہلے اس کی تیاری کرتے اور بڑے خشوع و خضوع سے اس میں مصروف رہتے۔ یادِ الٰہی ان کے نزدیک ہزار بادشاہی سے بہتر تھی۔ اٹھاون سال کی عمر میں بھی ان معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ سب والدین کی پرورش و پرداخت نیز گھر کے علمی ادبی

نیز مذہبی ماحول کے نمایاں اثر کی بنا پر تھا۔

حکیم سید کرم حسین اپنے صوفی مسلک اور مذہبی رجحانات کی حامل ایک ایسی شخصیت تھی جس کے سب مداح تھے۔ حکیم صاحب اپنے مشرب میں صلح کل و صلح عام کے قائل تھے اور خدا کی رحمتِ عام کا تصور ان کے دل میں شدت سے موجزن تھا۔ علماء کے باہمی قضایا اور اختلافات سے ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "مسلمانوں کی بڑی صلاحیتیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے میں صرف ہوتی ہیں باہمی اتحاد و اتفاق کی اس قدر کمی ہے کہ جگہ جگہ اس اختلاف کے مظاہرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ والصلح خیرا اور تخلوا باللہ پر کوئی عمل نہیں کرتا۔"

پھر ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ "کیسے علماء ہیں کہ اپنے آپ کو وارث الانبیاء کہتے ہیں۔ کیا انبیاء کرام ایسے ہی تھے کہ خدا کے ارشادات کے خلاف اپنے بیان اور اپنے اقوال کو ترجیح دیں۔"

مناظرہ بازی اور ایک دوسرے کے خلاف الزامات اور علماء کے باہمی جھگڑوں پر وہ کڑھتے تھے۔ مزاج میں شدت اور غلو نہیں تھا۔ قادری نسبت اور صوفیانہ نظریات سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ جہاں محفلِ سماع میں شریک ہوتے تھے وہاں علماء دیوبند سے بھی نہ صرف ذاتی مراسم تھے بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عبدالشکور وغیرہ کی تصانیف ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔

حضرت شاہ عبدالرزاق۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا عبدالحلیم شرر۔ مولوی عزیز مرزا۔ فرنگی محل کے مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی حضرت مولانا الیاس بانیٔ تبلیغ۔ مولانا سعید احمد دہلوی۔ مفتی کفایت اللہ اور شاہ محمد یعقوب نقشبندی مجددی سے حکیم سید کرم حسین کے مخلصانہ روابط تھے۔ تصوف کے دلدادہ ہونے کی بنا پر مذہبی مدارس میں تصوف کی تعلیم کو لازمی گردانتے تھے۔

حکیم سید کرم حسین نے حضرت میاں سلام اللہ شاہ سے بیعت کی اور دستارِ خلافت سے مزین ہوئے۔ اسی طرح آپ کا سلسلہ عابدی سے گہرا اور قریبی تعلق قائم ہوتا گیا۔

پیر جی شاہ عبداللطیف سے خصوصی مراسم تھے حکیم صاحب کی اہلیہ حکیم النساء

خصوصی تعاون رہا اور ان کی سرپرستی میں اس انجمن نے ریاست کے فلاح وبہبود کے لیئے کافی کام کیا۔

۲۔ جمیعتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام :۔

اس تنظیم کا تعلق اسلام کی اشاعت اور تبلیغ سے رہا۔ بعد میں اس انجمن کا دفتر انبالہ سے کان پور راقم کے گھر کے قریب منتقل ہوگیا۔

۳۔ جامع مسجد تجارہ :۔

۱۹۴۳ء میں اس مسجد کی توسیع کرائی اور اخراجات میں مسجد کو خود کفیل بنایا۔ خود مکرانہ جاکر سنگِ مرمر اور ۶ کاریگر ساتھ لائے ان معماروں نے حکیم صاحب کے گھر رہ کر اس کا صدر دروازہ تعمیر کیا۔ حکیم کرم حسین اس مسجد کے متولی بھی تھے۔
تجارہ کی قلندری مسجد ولال مسجد اور دہلی کی مسجد مچھلی والان اردو بازار کی تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر تعاون کیا۔ خانقاہ عابدی (الور) کی تعمیر میں بھی وہ پیش پیش رہے۔
اسی طرح اسلامیہ اسکول تجارہ جو حکیم صاحب کی حویلی میں ۱۹۱۵ء میں قائم ہوا تھا خبر گیری کرتے رہتے تھے۔
اسی طرح ملی رفاہی کاموں میں اپنی حیثیت کے مطابق ہمیشہ خرچ کرتے رہتے تھے۔

وفات :۔

تجارہ سے فسادات جو کہ تقسیم ملک کا باعث تھے حکیم صاحب نیز ان کے خاندان کے دیگر افراد ترک سکونت کر کے بھوپال آگئے تھے۔
۸۳ سال سے زیادہ عمر ہوگئی تھی پھر بھی اعضاء حد درجہ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔
۲۵ جون ۱۹۵۳ء کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ بوقتِ انتقال غفلت ونیم بیہوشی کے عالم میں وہ کبھی سر کا مسح کرتے۔ کبھی کہنیوں کو دھونے کی سعی کرتے۔

ح	حاجی حکیم قاضی محمد کرم حسین	خوش وضع و خوش عقیدہ و خوش اخلاق و خوشخصال
ك	کم خواب و کم خوراک و کم آمیز و کم سخن	خوددار و خودشناس و خودآگاہ و خود نیال
ی	یادِ خدا سے یہ کبھی غافل نہیں رہے	ہر وقت ان کو رہتا تھا انفاس کا خیال
م	مدِ نظر مقولہ تھا خیر الامور کا	ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال
ك	کردار کے تھے مرد تو گفتار میں تھے فرد	ہر قول بے نظیر تھا ہر فعل بے مثال
ر	رہتے تھے شان و شوکت و دولت سے بے نیاز	علم تحقیق و فضل کی دولت سے مالا مال
م	ماہر تھے آپ جملہ علوم و فنون کے	یعنی ہر ایک علم میں آپ اپنی تھے مثال
ح	حالاتِ انقلابِ زمانہ سے باخبر	کب تک عروج رہتا ہے ہوتا ہے کب زوال
س	سائل نہ خالی لوٹا کرم کا یہ حال تھا	جو ان کے پاس آتا تھا ہو جاتا تھا نہال
ے	یہ حال فن حکمت و طب میں تھا آپ کا	تشخیص لاجواب تھی تجویز بے مثال
ن	ناگفتہ حال نبض سے تشخیص جو کریں	ایسے حکیم ہوتے ہیں دنیا میں خال خال
ص	صوفی حکیم ناظم و ناثر ادیب تھے	حاصل تھا علم و فقہ و تصوف میں بھی کمال
ا	اوّل سے ایک وضع پہ قائم رہے سدا	یکساں تھا ان کا ماضی و مستقبل اور حال
ح	حمدِ خدا زباں پہ تھی اور دل میں یادِ حق	ایسے گئے ہیں پیشِ خداوندِ ذوالجلال
ب	حکیم سید کرم حسین صاحب	

طبی معرکے :-

حکیم صاحب گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے وہ بیک وقت شاعر، ادیب تھے تو ناثر بھی۔ منتظم تھے تو مہتمم بھی۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ایک لائق و فائق طبیب تھے۔ ان کے علاج سے کتنے ہی لوگ فیضیاب ہوتے جن کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ [illegible] ایسے علاج [illegible] تاریخوں میں درج ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد (شمس آباد) کا بیان ہے کہ ماؤنٹ آبو میں حکیم صاحب کے دورانِ قیام ایک لالہ جی کا ۷ یا ۸ سال کا اکلوتا لڑکا حکیم صاحب کی خدمت میں لایا گیا جس کو آپریشن آخری علاج تجویز کیا گیا تھا کیونکہ اس نے ایک چھوٹا چاقو نگل لیا تھا۔ لالہ جی اور ان کے گھر کے دیگر افراد کی پریشانی دیکھا دیکھی نہیں جاتی تھی۔ حکیم صاحب نے دو دوائیں

کے بعد دیگرے (غالباً سفوف مقناطیس کسی مناسب مسہل کے ہمراہ) استعمال کرائیں۔ یہ چھوٹا چاقو سلامتی کے ساتھ دستوں میں نکل آیا۔

۱۹۲۶ء میں دھومی لال سنار کے پوتے کو پتھری کی شکایت ہوئی۔ الور اور دہلی کے اسپتالوں میں آپریشن تجویز ہوا۔ حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حکیم کرم علی صاحب نے مولی کے عرق میں حجر الیہود خوب سحق کرا کر کشتہ تیار کرایا۔ اس کشتہ کے استعمال سے ۲ ماہ میں پتھری نکل گئی۔ بچے کو صحت ہو جانے کی خوشی میں دھومی لال سنار نے حکیم صاحب کو چاندی کا گلاس بنا کر دیا۔

تصانیف:-

ہر بڑے حکیم کی طرح حکیم سید کرم حسین نے بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اور مندرجہ ذیل کتب تحریر کیں۔

(۱) تحفہ جہاں معروف بہ کیمیائے عشرت:-

یہ جنسیات کے موضوع پر ایک ضخیم و معلوماتی کتاب ہے جس میں جنسی مسائل پر مستند کتابوں کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب عوام و خواص میں حد درجہ مقبول ہوئی اور پہلی اشاعت ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اس کتاب میں تین حصے ہیں۔

(۱) بزم خلوت۔

(۲) بزم راحت۔

(۳) بزم حسرت۔

لیکن صرف اول حصہ بزم خلوت ہی زیور طباعت سے مزین ہو سکا جس کے تین سو سے زیادہ صفحات ہیں۔

(۲) نصاب الطب المعروف طبِّ خالقِ باری:-

یہ ان کے استاد طب حکیم محمد حسن حاذق اور ان کی مشترکہ کاوشوں کا منظوم مجموعہ ہے

جس میں ادویہ کے فارسی عربی اور ہندی ناموں کے علاوہ امراض اور اصطلاحاتِ طب کو نظم کیا گیا ہے یہ فارسی کی درسی کتاب خالق باری کے طرز پر ہے ۱۹۲۳ء میں دوسری بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی تھی جسے نامور طبیب حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

۳۔ رسالہ ام الصبیان :۔

یہ کتاب زیورِ طباعت سے محروم رہی لیکن اس کتاب کی وجہ تصنیف کا ذکر حکیم سید کرم علی نے کیمیائے عشرت میں کیا ہے۔ چونکہ اس مرض ام الصبیان میں حکیم صاحب کے پانچ بچوں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے رفاہ عام کے فائدہ کے لئے یہ کتاب تحریر کی تھی ۔

۴۔ رسالہ خضاب :۔

یہ بزبانِ فارسی تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں خضاب کے متعدد نسخے ہیں۔

۵۔ رسالہ خواص آکھ :۔

آکھ جسے اکوڑہ یا مدار بھی کہتے ہیں اس کے فوائد پر ایک کتاب لکھی تھی اور ہیضہ کے لئے اس دوا سے ایک ایسی دوا تیار کی تھی جو ان کے تجربات میں سے تھی۔

۶۔ الحب معروف بہ من موہنی :۔

یہ تین موضوعات پر مشتمل ایک تعویذ و عملیات پر مشتمل ایک کتاب [illegible] زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی ۔

۷۔ رسالہ مقصود الطالبین :۔

حضرت سید محمد عرف سید شمس الحق قادری دہلوی مرید حضرت شاہ محمد غوث قادری غازی پوری زمانی وغیرہ مرشد حضرت سید شاہ آل احمد عرف اچھے صاحب قادری

مارہروی کے فارسی رسالہ مقصود الطالبین کا اردو ترجمہ ہے۔

۸۔ مفاتح الغیب :۔

حضرت امام جعفر صادقؓ کی طرف منسوب کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں قرآنِ پاک سے فال نکالنے کا طریقہ بیان کیا ہے۔

۹ تسخیر خلائق ترجمہ کتاب عقد المحبت :۔

اس کتاب میں قرآنی آیات کا فارسی زبان میں مطلب بیان کیا گیا تھا۔ حکیم سید کرم حسین نے اس کا اردو ترجمہ کر کے حاشیے میں ان کے فوائد تحریر کئے ہیں۔

۱۰۔ مفتاح الصلوٰۃ :۔

نماز کا یہ رسالہ ۱۹۱۱ء میں کتب حنفیہ سے تیار کیا گیا ہے جس میں نماز کے احکام اور نماز سے متعلق دیگر احکامات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

۱۱۔ معراج المومنین :۔

یہ کتاب بھی نماز کے بیان میں جس میں نماز کی فضیلت اور اس کو پڑھنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سلسلۂ اول کے طور پر یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں چھپی ہے

۱۲۔ رمضان المسلمین :۔

یہ کتاب منظوم طور پر روزوں کی فضیلت اور ان سے متعلق ضروری بیان کے مسائل میں ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سلسلہ دوم کے طور پر یہ کتاب بھی ۱۹۲۹ء میں چھپی ہے۔

۱۳۔ رسالہ فضائل الالحج :۔

اسلامی تعلیمات کے سلسلہ کا یہ تیسرا رسالہ ہے جو طبع نہیں ہو سکا تھا اور منظوم ہے۔

۱۴۔ چہل کاف :۔

ایک مشہور دعا ہے جس کا انتساب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں طبع ہوئی تھی۔

۱۵۔ درود مستغاث :۔

اس درود کو حضرت امام جعفر صادقؒ کی سند حاصل ہے ۱۹۰۴ء میں حضرت میاں سلام اللہ شاہؒ نے حکیم سید کرم حسین کو اس درود کو پڑھنے کی ترغیب دی تھی جو آخر زندگی تک بعد نماز فجر حکیم صاحب کے معمولات میں شامل رہا۔ حکیم صاحب نے اس کتاب کی ابتدا میں احادیث اور معتبر ماخذ کی روشنی میں درود کی فضیلت پر علمی حیثیت سے لکھا ہے۔

۱۶۔ حرز مرتضوی معروف بہ دعائے سیفی :۔

۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء میں یہ کتاب دہلی سے چھپی تھی۔ یہ ایک بابرکت اور مقبول دعا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تلقین فرمائی تھی۔ حضرت امام جعفر صادق نے اس کے فوائد اور برکتوں کے علاوہ اس کو بہت سے ناموں سے موسوم فرمایا ہے۔

۱۷۔ دربار سلطان الہند :۔

اس رسالہ میں خواجہ ہند الولی کے روحانی دربار کی منظر کشی کی گئی۔ یہ کتاب ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء میں دہلی سے چھپی تھی۔

۱۸۔ شانِ صابر ہدیۂ نظیر :۔

حکیم سید کرم حسین کا حضرت علاء الدین صابر کلیری کے مزار پر بہ سلسلۂ مرضاء دربار جانا ہوا۔ بارگاہ حضرت صابر کلیری میں مختلف شعراء نے جو منظوم خراجِ عقیدت پیش کی ہے۔ حکیم صاحب نے اس کو یکجا کر کے ۱۹۲۸ء میں چھپوایا۔

۱۹۔ ارشادِ واحدی :۔

ایک بزرگ حضرت حافظ قاری میاں واحد علی شاہؒ کے ملفوظات ارشادِ واحدی کے نام سے مرتب کئے ہیں۔

۲۰۔ تذکرہ احباب :۔

اپنے دو صاحبزادوں کی تعلیم پر ہوئے جشن میں احباب و متعلقین کے احساسات وخیالات کو یکجا کرکے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا۔

۲۱۔ جشنِ مولود :۔

۱۹۲۹ء میں حکیم صاحب کے پہلے نبیرہ کی پیدائش پر تجارہ میں جو جشن مسرت منایا تھا ایسے موقع پر حکیم صاحب نے پیش کئے گئے۔ قصیدہ قطعات ایک مقام پر یکجا کرکے شائع کیا تھا۔

۲۲۔ سورہ یٰسین :۔

۱۹۲۵ء میں سورہ یٰسین اور اس کا اردو ترجمہ مع خواص و فوائد پیش کیا تھا۔

۲۳۔ میلادِ خیر العباد :۔

میلاد شریف یعنی حضور پاک کی سیرت پر مشتمل یہ کتاب تھی۔

۲۴۔ کتاب المعالجات

اس کتاب میں اسباب۔ علامات اور تشخیص امراض پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اپنے اساتذہ کے مجربات درج تھے۔ اس کتاب کو عرفیت کے طور پر وہ کبھی کبھی مزاحًا "بیماروں کا دل چین" بھی کہا کرتے تھے۔

۲۵۔ بیاض طب۔ اس کتاب میں انھوں نے بزرگوں کے تجربات اپنے

تجربات اور مریضوں سے دواؤں کی کیفیات کو سن کر تین حصوں میں قلم بند کیا تھا۔
اس کے علاوہ چند کتب اور بھی تحریر کی تھیں جیسے شرح قصیدہ نمونیہ۔ مثنوی۔ نظمیں
رسالہ قدم شریف وغیرہ۔

حکیم صاحب نے طب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں اور خدمات کی تھیں
وہ سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل تھیں۔ حکیم سید کرم حسین نے غریب عوام
کی عام معلومات کے لئے تجارہ جیسے دور دراز مقام سے ۱۹۲۷ء میں ایک رسالہ
ماہنامہ مسیحائے زمان کے نام سے بھی جاری کیا تھا جس کی تعداد اشاعت قریب
پانچ ہزار تھی۔

شمس الاطبا،

خان صاحب حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی انصاری

۱۸۶۳ء — ۱۹۲۶ء

ممالکِ غیر میں طبِ یونانی کا نقیب

طبِ یونانی جو اپنے ابتدائی دور سے ایک خوش آئند مستقبل کی ضامن اور طب وابستہ تھی ابتدائی دور میں ہندوستان میں مشاہیر الاطبا، کی آمد مغلیہ دورِ حکومت میں سرزمین ایران سے شروع ہوئی۔ ہند کے بیشتر طبی خانوادوں اور اطبا، کا سلسلۂ تلمذ بھی ان ہی گرامی قدر اساتذہ تک جا پہنچتا ہے۔ خاندان شریفی دہلی اور خاندان عزیزی لکھنؤ کے بزرگ بھی ایرانی اطبا، کے تربیت یافتہ تھے غرضکہ اس وقت ملک ایران طبی شعبے میں سر برآوردہ طبی حیثیت کا مالک تھا۔

خاندان :-

حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کا خاندان برصغیر کی عظیم و نمایاں ہستیوں پر مشتمل ایک اعلیٰ خاندان تھا۔ ان کے اجداد ایران سے ہجرت کر کے واردانِ ہند ہوئے تھے۔ آپ کے خاندانی حالات آپ کی علمی قابلیتوں سے متاثر ہو کر انگلینڈ کے ایک نامور سیاح سیوج ہنری لنڈوز (Swej Henry Landose) نے اپنے سیاحت نامہ "ایران و ترکستان" میں تحریر کئے ہیں جو لاہور کی پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

پیدائش :- آپ کی پیدائش تعلیم کی دولت سے مالا مال علم و فن سے مزین

شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی مرحوم

ایک اعلیٰ انصاری خاندان میں ۱۵ مئی ۱۸۷۲ء کو لاہور میں ہوئی تھی۔ آپ ایک اعلیٰ انصاری خاندان میں اس وقت تولد ہوئے جب ہندوستان کے سیاسی و سماجی افق پر عظیم تبدیلیوں کے دوررس اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ایک جانب قدیم ذہن کے علماء پر مشتمل طبقہ اسلام کی بقا کے لئے جدوجہد کر رہا تھا تو دوسری طرف جدید علوم سے روشناس کرانے کے لئے اور دنیا میں مسلمانوں کو سرخرو کرانے کے لئے سرسید جیسے علماء پر مشتمل ان کے رفقاء برسرِ پیکار تھے۔

تعلیم و تربیت :-

ایسے پرآشوب دور میں والدین نے اپنے فرزندِ ارجمند کے لئے حسبِ قاعدہ ابتدائی تعلیم کی ابتدا گھر سے کی۔ عربی فارسی نیز انگریزی کی تعلیم کی تکمیل مدارس میں کر کے نورمل مڈل اسکول لاہور سے مڈل پاس کیا۔

طبی تعلیم :-

چونکہ ان کے والد حکیم سلطان محمود انصاری اپنے وقت کے نہ صرف ایک جید عالم ہی تھے بلکہ عالی مرتبت حکیم بھی تھے۔ اور جو باقاعدہ لاہور میں ایک کامیاب مطب و دوا خانہ کے مالک بھی تھے۔ طب کی تعلیم نہ صرف اپنے والد سے بلکہ دیگر باکمال اطباء سے بھی حاصل کی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں تحصیلِ تعلیم کے بعد لاہور کے میڈیکل کالج میں داخل ہو کر علم و عمل ڈاکٹری کی تعلیم کی شروعات کی۔ اس وقت ہندوستان میں جدید طب یعنی ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم صرف ڈپلومہ تک محدود تھی۔ لہٰذا حکیم غلام جیلانی صاحب نے ۱۸۹۵ء میں ایل۔ ایم۔ ایس کا ڈپلومہ یعنی سند حاصل کی اور اسی سال سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اور چند سال تک پنجاب کے کئی سرحدی مقامات پر مامور رہنے کے بعد آپ اپنی علمی و عملی لیاقت کے سبب منتخب ہو کر ملک ایران کو روانہ کئے گئے جہاں آپ کو نہایت عزت و شہرت ملی۔

ابتدا میں آپ گورنمنٹ برطانیہ کے قونصول یعنی سفیر متعینہ قائنات و کرمان کے

ڈاکٹر مقرر ہوئے ۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد آپ بمقام برجند دارالحکومت تہران (قائنات) ایران میں برٹش ایجنٹ مقرر کئے گئے ۔ جہاں آپ اپنی طبی قابلیت کے سبب نہایت ممتاز خیال کئے جاتے تھے ۔ چنانچہ جب جلالت مآب عمدۃ الامراء العظام امیر شوکت الملک حکمراں ولایت قاینات (نمائندہ حکومت) نے آپ کو اپنا طبی مشیر مقرر فرمایا ۔ اس کے ایک سال بعد آپ دولت عظمیٰ برطانیہ کے قونصول خانہ (سفارت خانہ) سیستان کے میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے وہاں پر بھی آپ کی طبی لیاقت کی نہایت قدر ہوئی ۔ چنانچہ جلالت مآب عمدۃ الامراء العظام امیر شوکت الملک حکمراں ولایت سیستان نے بھی آپ کو اپنا طبی مشیر مقرر فرمایا جہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی ۔

اعلیٰ حضرت ملک معظم کے کئی ایک محترم قونصلوں یعنی سفیروں نے جن کے ماتحت غلام جیلانی صاحب کو اپنے دوران قیام ایران میں طبی خدمات انجام دینے کا موقع ملا ۔ اپنے عنایت ناموں یا تصدیق ناموں میں جو حکیم غلام جیلانی صاحب کے پاس موجود تھے ۔ آپ کی طبی قابلیت خدمات و حذاقت کی بہت تعریف کی تھی ۔ نیز عالیجناب سر میک موہن صاحب بہادر کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی نے جو ۱۹۰۴ء میں سرحد افغانستان و ایران کے حاکم مقرر ہوئے تھے اور جن کے نام پر آج بھی میک موہن لائن بنی ہوئی ہے) نیز لارڈ رولڈشے صاحب بہادر جیسے امیر الامرائے انگلینڈ نے بھی جن کو ۱۹۰۰ء میں دوران سیاحت ایران میں آپ سے علاج کرانے کا اتفاق ہوا تھا اپنے تصدیق ناموں میں جو حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی کے پاس آخر وقت تک تھے ۔ آپ کی طبی قابلیت کی تعریف کی ہے ۔

تقریباً عرصہ آٹھ یا نو سال تک مختلف مقامات ایران میں کام کرنے پر ۱۹۰۳ء میں آپ کی حسن خدمت کے صلہ میں حکومت ہند نے بطور ذاتی اعزاز کے آپ کو خان صاحب کا خطاب عطا کیا تھا ۔ اس کے قبل دوران قیام ایران میں حکومت ایران نے بھی آپ کی بہت عزت افزائی کی اور ۱۹۰۲ء میں آپ کو شمس الاطباء کے معزز خطاب سے نوازا اور ۱۹۰۳ء میں اعلیٰ حضرت مظفرالدین شاہ مرحوم و مغفور شاہِ ایران نے شیر و خورشید کا ایک ممتاز تمغہ آپ کو مرحمت فرمایا ۔ پھر ۱۹۰۴ء میں مملکتِ

ایران کی شاہی مجلس حفظ الصحتہ نے آپ کو اپنا ممبر منتخب فرمایا۔

۱۹۰۶ء میں آپ اپنے وطن مالوف لاہور میں رخصت پر تشریف لائے۔ اور بعض خانگی امورات کے سبب ۱۹۰۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور تب ہی سے آپ لاہور میں مطب کرنے لگے۔ لیکن زیادہ تر آپ طبی تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹری و طبی کتب کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا آپ کو ابتدا ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ انڈین میڈیکل ریکارڈ کلکتہ جو کلکتہ کا ایک معروف انگریزی رسالہ تھا اس میں آپ کے کئی اعلیٰ مضامین شائع ہوئے اور دوبارہ آپ کو رسالہ مذکور کے انعامی مضامین انعامات مع سندات ملے جو ایک ہندوستانی طبیب کے لئے باعث افتخار تھا۔

علمی و ادبی کارنامے :۔

بعض مشہور اردو رسائل و جرائد مثلاً پیسہ اخبار۔ وطن اور وکیل میں بھی آپ کے علمی مذاکرہ مباحث اور اردو طبی رسائل مثلاً مجلہ طبیہ دہلی و اخبار حکمت لاہور اور خصوصاً رفیق الاطباء میں آپ کے کئی علمی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کی طبی تصنیفات کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ اس دور میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ان کی مخزن حکمت جس کا دوسرا نام "گھر کا حکیم و ڈاکٹر" ہے بے حد مقبول ہوئی۔ مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جائے گا کہ اب تک دونوں جلدوں کے چودہ پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اکثر پڑھے لکھے گھروں میں گھر کے اس حکیم و ڈاکٹر کی دونوں جلدیں موجود ہوتی ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو صرف ان دو کتابوں کو پڑھ کر ہی ڈاکٹر و حکیم بن گئے ہیں۔

مخزن حکمت کی مقبولیت کو دیکھ کر اسی طرز پر کئی اور کتب شائع ہوئیں لیکن کسی کتاب کو بھی وہ قدر و منزلت نہ ملی جو ان کی تصنیف کو حاصل ہوئی۔

بلاشبہ حکیم غلام جیلانی میں تصنیف و تالیف کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اور تصنیف و تالیف کی خداداد صلاحیت تھی۔ مختلف طبیہ کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی کے طبی امتحانات کے آپ اکثر ممتحن ہوتے تھے تاہم علاج و معالجہ سے پوری دلچسپی رکھتے تھے مطب میں وقت مقررہ سے حاضر ہوتے تھے۔

چنانچہ آپ کی تصانیف کی ایک ایک جلد ازراہِ قدردانی انڈیا آفس لنڈن اور برٹش میوزیم لنڈن کے سرکاری کتب خانوں میں بھی رکھی گئی تھی۔

تصانیف :-

مخزن الادویہ ڈاکٹری :- یا میڈیا میڈیکا باتصویر۔

اس کتاب کی دو جلدیں ہیں جلد اول کی ضخامت تقریبًا ایک ہزار ایک سو صفحات پر مشتمل ہے جلد دوم کی ضخامت تقریبًا ایک ہزار چار سو بیس صفحات کی ہے۔ ڈاکٹری کی علم الادویہ پر یہ ایک نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے اس کتاب میں امریکہ کی تمام ڈاکٹری مفرد و مرکب ادویہ کی تحقیق اور ان کی لاطینی انگریزی یونانی عربی فارسی سنسکرت ہندی اور اردو ناموں کی صحیح تطبیق کی گئی ہے اور ان کے مفصل افعال و خواص کے علاوہ تقریبًا ہر ایک دواء کا طریقۂ استعمال بھی لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب علمِ طب میں درحقیقت ایک نہایت ہی مفید اضافہ ہے۔ چنانچہ ملک کے اکثر نامی گرامی ڈاکٹروں و حکیموں نے اس کتاب کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس کتاب کی ایک ایک جلد نہ صرف انڈیا آفس لندن برٹش میوزیم شاہی کتب خانوں نیز امپیریل لائبریری کلکتہ شاہی کتب خانہ کلکتہ اور میڈیکل کالج [illegible] کی زینت بنی ہیں۔ جو درحقیقت باعثِ امتیاز و افتخار رہیں۔

۲۔ مخزن حکمت یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم :-

طب خانگی پر اردو زبان میں یہ ایک لاجواب و بے مثال کتاب ہے جس کے پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی ضخامت ایک ہزار ۴ سو صفحات ہے۔

۳۔ تاریخ الاطبّاء :- اس کتاب میں مشرق و مغرب کے متقدمین و متاخرین

مشاہیر الاطبا۔ یعنی حکیموں وئیدوں اور ڈاکٹروں کی زندگی کے دلچسپ طبی حالات طبی خدمات و تجربات نیز انکشافات کا بالوضاحت بیان ہے۔ اس کتاب کی ضخامت تقریباً نو سو صفحات ہے۔

۴۔ علاج بالمفردات یونانی و ڈاکٹری:۔ چھ سو صفحات کی ضخامت ہے۔

۵۔ ھندوستان کی جڑی بوٹیاں:۔ ایک ہزار صفحات کی ضخامت ہے۔

۶۔ لغات الادویہ:۔ سات یا آٹھ سو صفحات کی ضخامت ہے۔

قاموس طبی۔ عربی و فارسی یونانی لغات طبیہ کی ایک جامع کتاب۔

وفات:۔

افسوس کہ فروری ۱۹۲۶ء کو آپ اس عالم فانی سے رگھرا ئے عالم جاودانی ہوئے۔

طبی معرکے:۔

آپ کے لاہور تہران نیز دیگر مقامات کے مجربات و شاہکار علاج کی فہرست طویل ہے۔ مندرجہ ذیل واقعہ لاہور کا ہے۔

ایک مرتبہ یہ لاہور کے ایک لیڈر صاحب کو دیکھنے کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے جو تین چار ماہ سے جوڑوں کے درد میں مبتلا اور چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ آپ نے ان کو بغور دیکھنے کے بعد نبض دیکھی۔ ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کے جوڑ گھٹنے اور کہنی کے جوڑ سب سوجے ہوئے تھے۔ درد اور ہلکا سا بخار بھی رہتا تھا پیاس زیادہ لگتی تھی۔ بھوک بہت کم۔ قبض مسلسل رہتا تھا۔ رفع حاجت کے لئے بھی دوسروں کے محتاج نظر تھے۔ حکیم غلام جیلانی صاحب نے "وجع مفاصل بسبب قبض و ریاح" قرار دیکر حسب ذیل نسخہ تجویز کیا۔ اور مندرجہ ذیل ادویہ کو ایک بڑے پتیلے میں پکوا کر مریض کو اس میں یعنی ٹب میں پانی گنگنا کرا کے بٹھایا۔

سورنجان ایارج۔ شیطرج ہر ایک ۲ تولہ۔
تربد مقشر۔ تخم حنظل سنا مکی ہر ایک ۲ تولہ
افتیمون ایتون۔ تخم گرنی ہر ایک ۲ تولہ۔

مقل دس ماشہ سب ادویہ کو باریک کوٹ چھان کر آب گنگنا میں چنے کے برابر گولیاں بنائیں اور یہ پانچ ماشہ گولیاں رات کو سوتے وقت گرم پانی سے کھالیا کریں۔
اور مندرجہ ذیل روغن مالش کے لئے دیا۔

روغن اکسیر وجع مفاصل :۔

سورنجان تلخ ۵ تولہ ۔ قط تلخ فوہ ۔ زرد چوب ۔ دارہلد ۔ ہر ایک ۳ تولہ ۔ فوج ترکی عود صلیب ۔ دارچینی ۔ سبل الطیب بابونہ ہر ایک ۲ تولہ سب دواؤں کو باریک کوٹ کر ۲ سیر پانی میں دو دن بھگو دیں پھر اتنا پکائیں کہ پانی آدھا رہ جائے ۔ اس کو مل کر چھان لیں اور اس میں تل کا تیل پچاس تولہ شامل کر کے خوب جوش دیں ۔ جب پانی جل جائے اور صرف تیل رہ جائے تو چھان کر بوتل میں بھر لیں ۔ کافور ۲ تولہ روغن تارپین دس تولہ میں حل کر کے اسی تیل میں شامل کر کے حفاظت سے رکھ لیں یہ تیل گرم گرم مالش کر کے گرم گرم روئی باندھنے کی ہدایت کی گئی ۔
ترش و سرد غذاؤں سے پرہیز بتایا گیا ۔ ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ حکیم صاحب نے مریض کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے بہتر ہیں ۔ درد کم ہے ۔ اجابت روز ہو جاتی ہے، اٹھ کر بیٹھنے میں اب پہلی سی تکلیف نہیں ہے ۔
یہی دوائیں دو ہفتے مزید جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی ۔ تیسرے ہفتہ خود مریض حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوئے ۔ خوشی کا اظہار فرمایا ۔ اور مبارکباد دی کہ اتنے تکلیف دہ مرض پر آپ نے اتنی جلدی اور آسانی سے قابو پالیا ۔ طاقت کی دوا کی فرمائش کی ۔
ایک ہفتہ کے بعد حکیم صاحب نے یخنی سے معجون اذاراقی ۵ ماشہ صبح و شام کھانے کو مزید بتا دی ۔ اس کامیاب علاج سے لیڈر صاحب صحت یاب ہو گئے ۔ اور انھوں نے حکیم غلام جیلانی صاحب کے طریقۂ علاج اور دست شفا کی بہت تعریف کی ۔
آخر میں آپ کو اعزازی طور پر آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج دہلی کے بورڈ آف ایگزامنر مجلس متحنین کے ممبر نیز کالج مذکور کی ٹیکسٹ بک کمیٹی (مجلس معین

نصاب تعلیم) کے ممبر اور جماعتہائے مدرسہ طبیہ دہلی کے ممتحن اور جماعت زبدۃ الحکما و عمدۃ الحکماء و حکیم حاذق متعلقہ اسلامیہ کالج لاہور کے بھی ممتحن رہے تھے۔

⁘ ⁘ ⁘

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں آخونزادہ

۱۸۸۱ء
۱۲۹۷ھ

اُردو ادب بنگال کا

۱۹۴۷ء
۱۳۶۶ھ

تابندہ ستارہ

حکماء طب یونانی کے عام طور پر جید عالم و فاضل اور جنہوں نے میدان طب میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں اور علوم دیگر میں بھی کمال حاصل کیا ہے یعنی دستارِ فضیلت اور خرقۂ شیخت دونوں ایک جسم پر آراستہ رہے ہیں۔

ایسی شخصیتوں میں ایک نمایاں شخصیت شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں آخون زادہ ڈھاکہ کی بھی ہے۔ جس نے طب کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی تاریخ ساز کام کیا ہے۔

خاندان :۔

آپ کا خاندان نسباً فاروقی اور وطناً یاغستانی علاقہ صوبہ سرحد کے مشہور قبیلہ یوسف زئی کے پٹھان طبقہ سے متعلق تھا۔ ان کے والدِ محترم الحاج مولانا محمد خان شاہ آخون زادہ جنگلدنی واقع صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے جو لکھنؤ سے ہجرت کرکے ڈھاکہ اپنے ماموں محمد نعمان کے وہاں بنگال تشریف لائے اور ڈھاکہ میں شادی کرکے بود و باش اختیار کرلی تھی اور اس تقریب سے سرحدِ ہند کی یہ

دولت بنگال کی قسمت میں آئی تھی۔

پیدائش :-

جادو نگار ادیب اور نادرہ روزگار طبیب حکیم حبیب الرحمان خاں آخون زادہ کی ولادت باسعادت ۲۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو مطابق ۱۲۹۸ھ کو ڈھاکہ میں اس تاریخی قبیلہ کے گھرانہ میں ہوئی تھی۔

تعلیم و تربیت :-

مولانا ظفر احمد تھانوی کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ مزید تعلیم کے لئے سرکاری مدارس کی شکل دیکھی۔ اور بعد میں تکمیل تعلیم کے لئے صوبۂ یوپی کے مشہور شہر کان پور کا سفر کیا۔ ابتدائی صرف و نحو کے لئے کچھ اسباق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ سے جب وہ کان پور میں دے رہے تھے حاصل کی جس کا خاتمہ ۱۳۱۵ھ میں ہوا۔ زیادہ تر درسیات و تعلیم مولانا محمد اسحاق بردوانی سے حاصل کی۔ معقول مولانا احمد حسن کان پوری اور مولانا عبد الوہاب بہاری سے پڑھیں۔ جب کہ یہ علماء کان پور میں مدرس تھے۔ حدیث مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک شاگرد سے حاصل کی اور اجازت لی۔ اس کے بعد آگرہ میں مزید تعلیم حاصل کر کے عربی اسلامیات۔ منطق فلسفہ اور دیگر علوم میں واقفیت بہم پہنچائی۔ لیکن بقول پروفیسر حسن معصومی لیکچرار فلسفۂ اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی کے حکیم حبیب الرحمٰن کی تعلیم آگرہ اور بہار میں ہوئی۔

تعلیم طب :-

طب کی تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی میں حکیم عبد المجید خان دہلوی المتوفی ۱۹۰۱ء سے حاصل کر کے کمال حاصل کیا۔

۱۹۰۴ء میں تعلیم حاصل کر کے ڈھاکہ واپس آئے اور طبیب کی حیثیت سے

اپنی زندگی شروع کی۔ طبابت کے پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے دور دور تک شہرت پھیل گئی۔ اس شہرت اور عظمت کی وجہ سے نواب بہادر سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے آپ کو اپنا طبیب خاص مقرر کر دیا۔ نواب صاحب کو حکیم صاحب سے اس قدر دلی محبت پیدا ہو گئی کہ نواب صاحب کے اپنے ذاتی مسائل کیا سیاسی۔ سماجی مسائل میں حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔ حکیم حبیب الرحمٰن کے یہ ذاتی مراسم ڈھاکہ کے دیگر وارثین نواب حبیب اللہ الحاج خواجہ ناظم الدین خواجہ شمس الدین وغیرہ سے گھریلو رہے اور یہ ڈھاکہ کے نوابین جیسا کہ آگے کی تحریر سے معلوم ہو گا کہ ان کے تحریری و ادبی کام میں بہت معاون رہے۔

حکیم صاحب کی تعلیم تمامتر پرانے طرز کی ہوئی تھی مگر فطرت کے خزانے سے وہ ایک ذہین اور لطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اپنے اس فطری و فکری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں اور طب کے بعد جن فنون سے ان کو ذوق رہا وہ بھی تاریخ و ادب تھے۔ اور اسی سلسلے سے وہ مولانا شبلی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تھے۔

چنانچہ ۱۹۰۶ء ان کی زندگی کے لئے بڑی اہمیت کا سال ہے اسی سال مولانا شبلی سے جب وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے مولانا شبلی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کی طرز پر ہندوستان کے ہر صوبہ کی تصنیفات پر ایک محققانہ کتاب لکھی جائے۔ مولانا نے ان کے اس خیال کی تحسین کی اور بنگال کا حصّہ ان کے سپرد کیا۔

بقول علاّمہ سید سلیمان ندویؒ حکیم صاحب کے اکثر خطوں میں ان کی اس تصنیف کی بابت تذکرے ہوا کرتے تھے۔

سیاسی، سماجی و ادبی خدمات:۔

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام بمقام شاہ باغ ڈھاکہ عمل میں آیا۔

نواب وقار الملک اس کے اوّل صدر تھے۔ نواب سر سلیم اللہ اس کے اوّل سکریٹری اور حکیم حبیب الرحمٰن خاں اس جماعت کے اوّل جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔ حکیم صاحب کو اوائل عمری سے آخری دم تک دوسروں کے مفاد کا خیال رہا۔ چنانچہ ڈھاکہ کے مسلمانوں کی اہم خدمات انجام دیں۔

۲۴-۱۹۲۲ میں حکومتِ بنگال نے ایک کمیٹی بنائی جس کے سکریٹری کرنل حسان سہروردی مرحوم تھے حکیم صاحب اس کمیٹی کے سرگرم رکن رہے۔ اس کمیٹی کا کام یونانی طریقۂ علاج پر غور کرنے کے بعد حکومت کو رپورٹ پیش کرنا تھی کہ کلکتہ اور ڈھاکہ میں طبیہ کا قیام سود مند ہوگا یا نہیں۔

کمیٹی کی سفارشات کے بعد حکومت نے طبیہ کالج کے قیام کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا لیکن حکیم صاحب کو لگن لگی تھی اور جذبۂ ہمدردی رگوں میں موجزن تھا۔ مدارسِ عربیہ کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے مستقبل کا بھی احساس تھا جس کے لئے حکومت کی راہیں مسدود تھیں۔ چنانچہ ان وجوہ کے پیشِ نظر انھوں نے بڑی ہمت کر کے جواں مردی اور جذبۂ ایثار کی آڑ لے کر ۱۹۳۰ء میں طبیہ حبیبیہ کالج کے نام سے ایک کالج کرایہ کی عمارت میں قائم کیا۔

اس کالج کے پاس شدہ اطبّا، بنگلہ دیش ہندوپاک میں جا بجا مقام پر پھیلے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب کے اخلاق اور علمِ طب کی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کالج کے سالانہ جلسوں میں ملک کی بڑی بڑی اور مایۂ ناز ہستیاں نہ صرف شریک ہوتیں بلکہ معاونت بھی فرمائی۔ جن میں سر جون ہوبرٹ۔ مسٹر اے۔ کے فضل الحق مرحوم۔ خواجہ ناظم الدین مرحوم نواب خواجہ حبیب اللہ بہادر مرحوم۔ مسٹر ایچ۔ ایس سہروردی مرحوم خواجہ شہاب الدین مرحوم قابلِ ذکر ہیں۔ بحیثیت طبیب حکیم حبیب الرحمٰن آخون زادہ کی سارے ملک میں شہرت تھی چالیس برس تک آپ نے طبابت کی اور لاکھوں لوگوں کو آپ نے فائدہ پہنچایا۔

حکومتِ ہند نے ۱۹۳۹ء میں حکیم حبیب الرحمٰن خان آخون زادے کی طبِ یونانی کی خدمات اور شہرت دیکھ کر شفاء الملک کا خطاب عطا کیا جو بعد میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ہدایت کے بموجب حکومت کو واپس کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے "انجمن اطبا، مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک تنظیم اطبا، کی قائم کی تھی جس کے آپ تا حیات صدر رہے۔
۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کی ملی جلی حکومت انٹریم گورنمنٹ کے دور میں دہلی میں طب یونانی کے فروغ کے لئے وزارتِ صحت نے جو سہ رکنی کمیٹی بنائی تھی اس کے ایک رکن شفاء الملک مرحوم بھی تھے۔
حکیم حبیب الرحمٰن کی ادبی حیثیت کا آغاز بھی ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے۔ اسی سال انھوں نے ڈھاکہ سے "المشرق" کے نام سے ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ پھر "جادو" کے نام سے ایک اور ادبی و علمی رسالہ جاری کیا اس کے ساتھ ہی ساتھ "معارف" کے ابتدائی پرچوں میں بھی ان کے مضامین چھپے تھے۔
مرحوم حکیم صاحب کے قلم میں بڑی لطافت تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے نہ ہوسکی۔ لیکن تھوڑی بہت اگر کسی سے ہوئی ہے تو عجیب بات ہے کہ وہ بنگال ہی کے جادو گرانِ ادب سے ہوسکی ہے ان میں پہلا نام نصیر حسین خاں کلکتہ کا اور دوسرا نام حبیب الرحمٰن ڈھاکہ کا ہے۔
ان کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا اور اس مقصد کے تحت مرحوم نے انجمن ترقی اردو مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت طبیہ حبیبیہ کالج میں برابر مشاعرے اور جلسے ہوا کرتے تھے جن میں ممتاز شعراء، ادیب اور عمائدینِ شہر برابر شرکت کیا کرتے تھے۔
اس کے ساتھ ساتھ حکیم شفاء الملک صاحب مرحوم آل انڈیا ریڈیو سے بنگال کی خصوصیات پر برابر تقاریر نشر کرتے تھے۔ حکیم صاحب ان تقاریر کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے مگر شرط یہ تھی کہ محکمۂ نشریات ان کو کتابی شکل میں شائع کرے گا جس سے آئندہ کی نسلوں کو فائدہ ہو۔ حکیم صاحب کی آل انڈیا ریڈیو سے جن موضوعات پر نشریات ہوتیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ڈھاکہ اب سے پچاس سال پہلے۔
(۲) مساجد ڈھاکہ۔

(۳) کچھ پرانی باتیں۔
(۴) تاریخ شعراء اولیائے بزرگانِ دین۔
(۵) ڈھاکہ کی عمارات۔
(۶) ڈھاکہ کے قدیم خاندان اور ان کے رسومات۔
(۷) شائستہ خان کا بند دروازہ۔

تصانیف :۔

ہر بڑے حکیم اور ادیب کی طرح حکیم صاحب نے بھی متعدد شاہکار سپردِ قلم کیئے ہیں۔ بنگال کی تاریخ اور اس کے جغرافیائی خصوصیات اور نقشے پر حکیم صاحب کو مکمل عبور حاصل تھا۔ بنگال سے متعلق "ثلاثہ غسالہ" کا نام انھوں نے حافظ شیراز کی اس غزل سے کیا تھا جس کو حافظ شیراز نے سلطان بنگالہ کے نام لکھ کر بھیجا تھا۔

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی غزل کا ایک ٹکڑا ہے "ثلاثہ غسالہ می رود" "الفاروق" اور "حیاتِ سقراط ان کی طالب علمی کے رسالے ہیں۔ ان کی دیگر تصنیفات کے نام مساجد ڈھاکہ۔ ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے۔ شعرائے ڈھاکہ وغیرہ ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "آسودگانِ ڈھاکہ" تحریر کی تھی جو ۱۹۴۶ء کے آخر میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ڈھاکہ کی سرزمین میں مدفون بزرگانِ دین کے مزارات کی تحقیق اور تذکرے ہیں اس کے بعد آسودگانِ ڈھاکہ کا مصنف خود ڈھاکہ کی خاک میں آسودہ ہوگیا۔
حکیم صاحب کو قدیمی سکوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں دو سو گیارہ سکوں کا عطیہ ڈھاکہ کے عجائب گھر کو دیا گیا جو مہتمم عجائب خانہ نے ۱۹۳۶ء میں ایک کتاب سکوں کی باتصویر شائع کی اور بعد میں حکیم صاحب کی تصویر کے ساتھ ایک ڈاک ٹکٹ بھی شائع ہوا۔
حکیم صاحب کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں اردو عربی فارسی کی نایاب

اور بیش قیمت کتابیں تھیں۔ جو ان کے انتقال کے بعد کچھ کتابیں ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری کو ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی پروفیسر شعبۂ اردو و فارسی کی معرفت دے دی گئی تھیں۔ ان کی بیگم صاحبہ نے حکیم صاحب کی وصیت کے مطابق خاندان کے لوگوں کے سامنے بغرض اشاعت و طباعت حکیم صاحب کے تحریر کردہ کچھ کتب کے نسخے ڈاکٹر شادانی کو دے دیئے تھے بدقسمتی سے ڈاکٹر شادانی صاحب بھی کچھ عرصہ بعد مرحوم ہو گئے اور ان مسودات کا کیا حشر ہوا یہ نہ معلوم ہو سکا۔

وفات :-

مگر آہ وہ مسیحا نفس جو دوسروں کو موت کے پنجے سے چھڑایا کرتا تھا آخر ایک دن وہ آیا جب وہ خود اس کے پنجہ میں گرفتار ہوا۔ مرحوم کو کئی ماہ پیشتر اس آنے والے حادثہ کا علم جیسے ہو گیا تھا۔ بعض احباب سے تذکرہ اس بابت کر چکے تھے کہ میں جب جاؤں گا دفعتاً جاؤں گا۔ جس دن (۲۲ فروری) یہ واقعہ پیش آیا حسب معمول صبح کو بیدار ہو کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں شریک ہوئے اور مطب میں مریضوں کو انہماک سے دیکھا۔ مغرب کے بعد نشست گاہ میں بیٹھ کر دوستوں سے باتیں کیں جو مختلف موضوعات پر تھیں۔ اثنائے گفتگو میں معلوم کیا کہ آج مولانا عثمانی ڈھاکہ میں تشریف نہیں رکھتے ؟ ان کو اپنی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوچ کا وقت قریب ہے اس لئے کچھ وصیتیں بھی کر چکے تھے جن میں ایک یہ تھی کہ میری نماز مولانا ظفر احمد تھانوی پڑھائیں اور اگر وہ نہ ہوں تو پیر جی عبد الوہاب مہتمم مدرسہ اشرف العلوم پڑھائیں۔

شومئ قسمت کہ مولانا عثمانی اس دن کہیں باہر تھے۔ ۳ تین بجے شب کو قلبی دورہ پڑا۔ طبیب کے لئے آدمی گیا ان کے آتے آتے مسافر عالم بالا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ آناً فاناً خبر شہر ڈھاکہ و گرد و نواح میں پھیل گئی۔ صبح کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ جنازہ میں مجمع اتنا کثیر تھا کہ شرکاء جنازہ و سامعین کہتے ہیں کہ شاید کسی کے جنازہ میں اتنا اژدہام رہا ہو۔ حسب وصیت نماز جنازہ پیر جی عبد الوہاب نے پڑھائی اور تدفین عظیم پور دائرہ شریف کے قبرستان میں انجام پائی۔ ان کی

قبران کے والد مرحوم کی پائنتی ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ اپنی حیات ہی میں زمین خرید چکے تھے۔

ان کے جنازہ میں ہر طبقہ کے افراد شامل تھے اور سوگ میں ڈھاکہ کے ہر طبقہ کا بازار بند رہا۔

ادباء و شعراء نے اپنے اپنے طور پر قطعات، تاریخ و مرثیہ لکھے۔ اور اہل قلم نے متعدد اخبار میں نذرانہ پیش کئے۔

فروری آئی ہے پھر یاد حبیب آنے لگی — چشم پُرنم رنج و غم سے اشک برسانے لگی

خدمتِ انسانیت کا ایک سراپا تھے حبیب — بات جیسی تھی زبان خلق پر آنے لگی

کار ہمدردی شفاء الملک کا تھا مشغلہ — روح اہل خیر دیکھو وجد میں آنے لگی

آپ کی مسکیں نوازی دیکھ کر اقوام غیر — خلق ڈھاکہ آپ کے ہر وقت گن گانے لگی

ہے فن طب پر جو احسان آپ کا بنگال میں — کیا بتاؤں غم سے ہچکی پے بہ پے آنے لگی

دیکھو مرزا اب زباں کھولو نہ اپنی چپ رہو
کالی کالی قلب پر غم کی گھٹا چھانے لگی

مصنف سیرۃ النبی سید سلیمان ندوی ماہر دینیات نے ان کی وفات پر لکھا کہ

"حبیبی۔ دوستوں نے تمہارے لئے مرثیئے لکھے۔ احباب نے تمہارے فراق میں آہ جگر سوز کھینچی۔ جاننے والوں نے تمہارے اوصاف گنائے۔ ماننے والوں نے تمہارے احسانات یاد کئے مگر تم اس دنیا میں ہو جہاں اس دنیا کی مدح و ستائش کی حکایتیں نہیں پہنچتیں مغفرت کی دعائیں تمہارے لئے ہیں غفور و رحیم ان کو قبول فرمائے" آمین۔

پسماندگان :-

بعد انتقال ایک وسیع حلقۂ احباب سوگواروں کا اور کئی چار صاحبزادے و دو صاحب زادیاں حیات چھوڑی تھیں۔

۱۔ الحاج حکیم ارتضاء الرحمٰن خان صاحب آخون زادہ پرنسپل طبیہ حبیبیہ کالج ڈھاکہ۔

(۲) حکیم حسام الرحمٰن خان آخونزادہ ۔ آپ طبیہ حبیبیہ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں اور آپ کا مطب بڑا دوا خانہ کے نام سے نیو مارکیٹ ڈھاکہ میں ہے ۔
(۳) اجتباء الرحمٰن صاحب جو ایل ۔ آئی ۔سی میں اعلیٰ عہدے پر تھے ۔
(۴) اصطفاء الرحمٰن خاں ۔

حکیم صاحب کا دستر خوان بہت وسیع تھا ۔ ہر کھانے کے وقت احباب کا مجمع لگا رہتا تھا ۔ ان احباب میں مولانا ظفر احمد عثمانی خواجہ شہاب الدین ۔ سید محمد طیفور ۔ ڈاکٹر محمود حسن سابق چیئرمین پبلک سروس کمیشن ڈاکٹر محمود حسین خاں قابل ذکر تھے جا بجا تذکروں میں حکیم صاحب مرحوم کے دستر خوان کا ذکر بار بار آیا ہے ۔ جس میں نہاری شب دیگ ۔ حلیم قبولی ۔ مرغ کباب ۔ مرغ پلاؤ ۔ زعفرانی ۔ لب کباب ۔ کشمیری سالن ۔ شکاری سالن ۔ حکیم صاحب کے دستر خوان کی خاص ڈشیں ہوا کرتی تھیں جس کو وہ بڑے اہتمام سے پکواتے اور کھلانے میں مسرت حاصل کرتے تھے ۔

معرکے :۔

بعض دفعہ تو مریض کی تشخیص و تجویز اور علاج لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا تھا ۔ اکثر و بیشتر صورت دیکھ کر یا آواز سن کر اور وہ بھی ریڈیو کی آواز سن کر مریض کا مرض اور اس کا علاج تبلا دیا کرتے تھے اور مریض اس پر عمل کر کے صحت یاب ہو جایا کرتے تھے ۔

مرحوم طبیب اور حاذق طبیب تھے قیافہ اور نباضی میں حد درجہ کمال رکھتے تھے ۔

۱۹۴۳ء میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی علالت کا حال مولانا ظفر احمد عثمانی سے سن کر مرض کی تشخیص کی اور دوا تجویز کی ۔ جب تھانہ بھون سے خطرناک حالت کی اطلاع آئی تو کہا کہ اب دوا بیکار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وقت آخر آ پہنچا اور آخر جیسا انھوں نے کہا ویسا ہی ہوا ۔

ایک بار ان کے ایک مریض دہلی تشریف لے گئے اور اپنے مرض کے سلسلہ میں

مسیح الملک جناب حکیم حافظ محمد اجمل خان سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ آپ یہاں سے تشریف لائے ہیں۔ جواب ملا کہ ڈھاکہ سے۔ اس پر مسیح الملک صاحب نے فرمایا۔ کیا اب حکیم حبیب الرحمٰن صاحب وہاں تشریف نہیں رکھتے۔

اس کے بعد انھوں نے نسخہ لکھ دیا۔ اس نسخہ میں اور حکیم حبیب الرحمٰن کے نسخہ میں سرِمو فرق نہیں تھا۔

حکیم صاحب کی طبی حذاقت کا ایک واقعہ خود علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مصنف سیرۃ النبی سے منسوب ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

دو کئی سال کی بات ہے۔ میں نے ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ مرحوم نے ڈھاکہ سے لکھا۔ میں نے ریڈیو پر آپ کی آواز سنی جو آپ کے ضعفِ قلب کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کی خبر جلد لیں۔ چنانچہ چند روز کے بعد ہی مجھے اسی قسم کے سخت مرض کا سانحہ پیش آیا جس سے اللہ تعالیٰ نے جانبری فرمائی۔"

غرضکہ ایسے ایسے قابل عالم فاضل طبیب گذرے ہیں جو ادب کا میدان ہو یا طب کا۔ دونوں مقامات پر ان کی حیثیت امرِ مسلم ہے۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر

۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء   ۱۹۴۳ء

(ماہر سرجن طبیب)

سرزمینِ لکھنؤ کو علوم و فنون علاج و معالجہ شعر و ادب کی وجہ سے خصوصی مقام حاصل رہا ہے اور اسی مرکزیت کی وجہ سے دور دراز مقامات سے علماء و فضلاء نیز اطباء ہجرت کر کے لکھنؤ منتقل ہوتے رہے تھے۔

خاندان :-

ان ہی اوقات میں حکیم محمد ہادی رضا خاں کے پردادا حکیم مولوی حاجی محمد علی رضا ۱۸۱۵ء میں ایک بہت مشہور زمانہ طبیب تھے جو کشمیر کی جانب سے لکھنؤ آکر آباد ہو گئے تھے۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں و مہاراجاؤں کا کامیاب علاج کر کے خاص و عام میں بہت ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم مولوی محمد حسن رضا ۱۸۲۵ء میں اپنی فنی قابلیت اور تجربہ کی بنیاد پر راجہ صاحب بنارس کے طبیب خاص ہو گئے تھے اور اپنے زمانے کے طبیب اعظم مشہور تھے۔ حکیم مولوی محمد حسن رضا کے دو صاحبزادے تھے۔

۱۔ حکیم مولوی احمد رضا خاں۔

۲۔ حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں۔

آپ کے والدِ بزرگوار حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں ۱۹۰۱ء میں والیٔ ریاست

ماہر سرجن حکیم محمد ہادی رضا خاں صاحب مرحوم

رام پور نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کے طبیب خاص مقرر ہو گئے تھے اور ریاست رام پور میں نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کے زمانے میں عرصہ تک افسر الاطباء یعنی ڈائریکٹر رہے۔ آپ کے بڑے بھائی حکیم محمد احمد رضا خاں کا مطب ریاست رام پور میں بہت کامیاب تھا اور مطب میں مرضاء کا مجمع لگا رہتا تھا۔

حکیم محمد رضا خاں نے بڑے معرکے کے علاج کیے تھے۔ ان معرکے کے علاجوں سے متاثر ہوکر ہی نواب صاحب نے ان کو رام پور کے سرکاری شفا خانوں کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔

حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں کو درس و تدریس کا بڑا شوق تھا۔ آپ کے ذاتی مطب میں طالبانِ فن طب کا ہمیشہ مجمع رہتا تھا۔ دور دور سے شائقین فنِ طب تحصیلِ علم کی غرض سے حکیم حسین رضا کی خدمت میں آتے تھے۔ درس و تدریس کا حلقہ جب زیادہ وسیع ہو گیا تو ۱۹۰۲ء میں حکیم مولوی محمد حسین رضا نے صوبہ کے مرکزی مقام لکھنؤ میں ایک طبی درسگاہ " بنام " منبع الطب کالج" کی بنیاد رکھی اور با قاعدہ طلباء کے داخلے و تعلیم کا انتظام کیا۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف طبی خانوادہ خاندانِ عزیزی جھوائی ٹولہ کا آپ کے خاندانِ رضائی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ خاندانِ رضائی کی کئی صاحبزادیاں خاندانِ عزیزی میں منسوب ہو کر گئیں تھیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے مشہور طبیب شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب مرحوم کی والدہ محترمہ حکیم محمد حسین رضا خاں کی ہمشیرہ تھیں۔

پیدائش :-

آپ کی پیدائش یوپی کے مشہور شہر ادب لکھنؤ کے مرکز طب و علم جھوائی ٹولہ ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۸ء مطابق ۲۶ محرم ۱۳۰۶ھ بروز چہارشنبہ کو ہوئی۔

تعلیم و تربیت :-

حسبِ توقع تعلیم کی ابتداء گھر سے ہوئی۔ والد کے ریاست رام پور سے وابستہ ہونے کی بناء پر گھر پہ ابتدائی اردو فارسی اور کچھ انگریزی کی تعلیم ہوئی۔ آپ بچپن

سے ہی بڑے ذہین چست اور محنتی ہونے کے ساتھ انتہائی باہمت وخداداد قابلیت کے حامل تھے۔ اردو فارسی انگریزی نیز قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم سے فراغت کرکے پرائیوٹ طور پر انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں انگریزی تعلیم ترک کرکے منطق، فلسفہ اور عربی وفارسی کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔ مولوی غلام محمد پنجابی سے عربی صرف ونحو اور فلسفہ کی تعلیم شروع کی اور بعض کتب ادب مولانا محمد طیب عربی مکی سے پڑھیں۔ علوم عربیہ میں آپ کو فخرالاساتذہ حضرت مولانا محمد عبدالغفار مرحوم رام پوری اور استاذ الاساتذہ مولانا حاجی حافظ ابوالافضال محمد فضل حق پرنسپل مدرسہ عالیہ ریاست رام پور سے تلمیذیت کا فخر حاصل کیا۔

طبی تعلیم :-

۱۹۰۴ء سے اپنے پدر محترم حکیم محمد حسین رضا خاں سے باقاعدہ علم طب کی تعلیم حاصل کی اور جو جو کتب طب آپ پڑھتے جاتے تھے وہ وہ کتب طب طبی طلباء کو پڑھاتے بھی جاتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں آپ کی طبی درسیات ختم ہوگئیں اور آپ کے والد بزرگوار نے اپنے دست مبارک سے سند فراغت عطا کی۔ آپ نے ریاست کے سرکاری کتب خانے میں قلمی کتب طبیہ وحواشی غیر مطبوعہ کا گہرا مطالعہ فرمایا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کے والد افسر الاطباء حکیم محمد حسین رضا خاں کا انتقال ہوگیا اور طبی درسگاہ ومطب کی ساری ذمہ داریاں آپ پر ہی آن پڑیں۔

نام :-

آپ کو حکیم خواجہ محمد ہادی رضا خاں کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

قومیت :- آپ نسبی طور پر کشمیری مغل ہیں۔

مذہب :-
آپ سنی حنفی العقائد تھے اور یہی مسلک آپ کے اجداد کا تھا۔

شعری وادبی ذوق :-

حکیم ہادی رضا کو شعروشاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ماہر تخلص فرماتے تھے اور بہت
باذوق شاعر تھے۔ مرکز شعروادب لکھنؤ کی اہم علمی و ادبی نشستوں میں شرکت
فرماتے تھے اور داد وتحسین سے سرفراز کئے جاتے تھے۔ حکیم ہادی رضا کا شعری
مجموعہ ان کے صاحبزادے حکیم محمد صابر رضا ادیب کی کوششوں سے ان کے
انتقال کے بعد کلامِ ماہر کے نام سے زیورِ طباعت سے مزین ہوا جس پر تعارف
یوپی کی معروف شخصیت الحاج حضرت مولانا افق چوبانی وارثی نے اور کلام پر تبصرہ
ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا تھا۔

حکیم صاحب نے حمد و نعت غزلیات قطعات تاریخ نیز سیاسی انداز
سے نظمیں کہی تھیں۔ حکیم صاحب کے شعری مجموعہ کی اشاعت پر حکیم مولوی عبدالجلیل
خان ہما فاضل وکامل بجنوری نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا۔

ع مہارت کاملہ کا بہتر نمونہ سمجھو "کلام ماہر"

۱۹۶۹ء

شاگرد :-

حکیم ہادی رضا نے شعروشاعری میں کسب فیض سخن حضرت علامہ افق موہانی سے
حاصل کیا تھا۔ خان رام پور کا خاندانی لقب ہے اور خواجہ بوجہ والدین کے
صحیح النسب کشمیری ہونے کے جو اہل کشامرہ کا علمی و بزرگی و [illegible]
ہے۔

حکیم ہادی رضا نے بہت تھوڑا کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ [illegible]
مقولہ ہے کہ "یہ دیکھو کیا کہا ہے یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے" [illegible]
بقول حکیم ہادی رضا اگر حمد باری میں دعا کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

اور نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

اللہ اللہ درد دل کی ہے دوا ۔۔۔ اللہ اللہ میں عجب دیکھی شفا
اللہ اللہ ہے فقیروں کی صدا ۔۔۔ اللہ اللہ ہے غریبوں کی ندا

اللہ اللہ ہے بڑا مشکل کشا　　اللہ اللہ سب کا ہے حاجت روا
اللہ اللہ باعث ایجاد خلق　　اللہ اللہ سامع فریاد خلق
اللہ اللہ دین ہے ایمان ہے　　اللہ اللہ نیک رسیوں کی جان ہے

عشق و محبت کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ، یاد حسین منقبت، غرضکہ ہر میدان میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

متفرقات میں قطعات رباعیات، قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔

سامنے مرے ذرا بیٹھ تو جائے کوئی　　نہ کرے بات تو صورت ہی دکھائے کوئی
حال جو دل کا ہے کیا تم کو بتائے کوئی　　کس لئے جان مصیبت میں پھنسائے کوئی
میں نے غیروں کو جو دیکھا تو کہا اس نے　　مرے گھر اب نہ خدا کے لئے آئے کوئی
جل کے بولے جو کیا میں نے سوال بوسہ　　تو وہ ہے تجھ سے تو بس منھ نہ لگائے کوئی
شکوۂ غیر پہ منھ پھیر کے ظالم نے کہا　　جو جلے ہم سے اسے کیوں نہ جلائے کوئی
ہر ذرا سی بات پہ جو روٹھنے والا ٹھہرا　　کیا کرے ایسے کو کس طرح منائے کوئی
اپنی آنکھوں کو اٹھا کر یہ کہا غصے سے　　میری محفل میں خبردار نہ آئے کوئی

تو ہی جب بھول گیا کوچۂ جاناں ساہر
تجھ کو دیوانہ ہے جو راہ بتائے کوئی

۱۹۲۶ء میں مسیح الطب طبیہ کالج کے سالانہ جلسہ کے مشاعرے میں ایک ایسا مطلع پڑھا تھا جو اللہ والوں کے کام کا تھا اور بعض نے تو اسے مناجات میں شامل کر کے وظائف تک میں برابر استعمال کیا۔ جو مطلع پڑھا وہ مندرجہ ذیل ہے۔ ؎

رحمت پکارتی ہے کہ دست دعا نہیں
باب کرم کھلا ہے کوئی مانگتا نہیں

اس سالانہ جلسہ و مشاعرے میں جب جلسۂ تقسیم اسناد ہوا تو نواب سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری اسٹیٹ گورنر یوپی نے صدارت فرمائی تھی۔

حکیم ہادی رتھا کے دیگر مشاغل میں شعر و شاعری کا شغل بھی داخل و شامل تھا جس سے وہ اکثر و بیشتر تفنن طبع بھی حاصل فرماتے رہتے تھے اور یہی ایک ایسا شغل تھا جو ان کی دوسری افکار و پریشانیوں کا ازالہ کہلائے جانے کا مستحق

ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اپنے برادرِ نسبتی کے عقدِ سعید پر جو حسب دستور سہرا لکھا اور بموقعہ حاجت پڑھا تھا تو سننے والے سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔

سر سے باندھا ہے جو ترے قد کے برابر سہرا ۔۔۔ ڈھل گیا نور کے سانچے میں سراسر سہرا

دُر و انجم کو اگر جمع کریں بحر و فلک ۔۔۔ نہ بنے اُن سے بھی ہرگز ترا گز بھر سہرا

کس کی شادی کی ہے یہ دھوم بنا کون بنا ۔۔۔ زہرہ گاتی ہے خوشی سے جو فلک پر سہرا

جس طرح پرتوِ خورشید سے ذرہ کو فروغ ۔۔۔ یوں ترے روئے درخشاں سے منوّر سہرا

کس کی تعریف لکھوں مجھ کو عجب حیرت ہے ۔۔۔ طرّہ سہرے سے فزوں طرّہ سے بڑھ کر سہرا

اپنے سہرے کی گھڑی تجھ کو مبارک ہو رشید
تیرے ماہرؔ نے کیا ختم دعا، پر سہرا

حکیم ماہرؔ کے زمانے میں لکھنؤ جو نہ صرف مرکزِ علم و ادب تھا بلکہ علوم و فنون اور علاج و معالجہ کا معتبر اور منفرد مقام تھا اس وقت وہاں زبان دانی پر زورِ طبع زیادہ صرف کیا جاتا تھا۔ اس کے نمونے جا بجا کلام ماہرؔ میں موجود ہیں مستند روایاتِ شعری سے انحراف ان کے یہاں قطعی نہیں ہے لیکن اس روایتی شاعری میں بھی باوجود مصروفیت کے حکیم ہادی رضا ماہرؔ نے بعض اشعار نہایت روایتی تسلسل اور خوب صورت انداز میں پیش کئے ہیں۔

دنیا میں آکے شانِ بشر کچھ نہ پوچھئے ۔۔۔ سب کچھ ہے اختیار مگر کچھ نہ پوچھئے

(۲) رسائی میرے تخیل کی رنگ و بو تک ہے ۔۔۔ مجھے حقیقتِ فصلِ بہار کیا معلوم

(۳) کیا جانے کسی امید کے پردے میں بے خودی
محوِ نظارہ ہو گئی ہستی کے ...

(۴) ماہر اسی کا نام فریبِ حیات ہے ۔۔۔ انسان کو اپنی موت کی پروا ذرا نہیں

اگر حکیم ہادی رضا کی حیات کچھ اور وفا کرتی تو وہ اس چمن زار میں اور بھی خوب صورت گل کھلا سکتے تھے۔ کیونکہ کلام ماہرؔ میں موجود ان کی غزلیات، نظمیں قطعات اور فن تاریخ گوئی اس بات کی غمازی کرتی ہیں اور شاہد ہیں۔

حکیم ہادی رضا کو نہ صرف شعر و شاعری سے بلکہ ادبِ طب سے ایک گونہ

محبت تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کہا تھا کہ وہ اس سوسائٹی کے ایک ممتاز فرد تھے۔ جب شعر گوئی اور سخن سنجی ہماری تہذیب اور شائستگی کا ایک جزو لاینفک سمجھی جاتی تھی۔ کوئی کسی علم و فن میں دستگاہ رکھتا۔ سخن گوئی کا ذوق یا سخن فہمی کا شوق ضرور رکھتا تھا۔ حکیم صاحب پیشہ کے اعتبار سے تو طبیب تھے لیکن طبیعت کو شعر گوئی سے کوئی مناسبت تھی۔ طبعی مناسبت نہ بھی ہوتی تو بھی وہ اس فن کو اپنے پیشے میں کامیابی کے لئے ضرور حاصل کرتے۔ کیونکہ یہ فن ایک علم مجلسی بن چکا تھا۔ حکیم صاحب نے بھی اپنی حذاقت کے ساتھ ساتھ اپنی موزوں طبعی کے کرشمے متعدد شعر و شاعری کی مجلسوں میں دکھائے۔ اور ان میں کامیاب بھی رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ حکیم ہادی رضا تاریخ طب میں اپنی حیثیت سے واقف تھے اور اپنی عظمت کو پہچان گئے تھے۔ ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کو پہچان گئے ہوں۔

اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان "لمحات حیات ما" ہے اپنے شب و روز کے اوقات مصروفیات قلم بند کئے ہیں جس سے ان کی شخصیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

منظور ہے ما تم سے ملاقات تو یارو
وہ شب کو تمھیں خانۂ ویراں میں ملے گا

پھر آخر شب اس کو اگر ڈھونڈیں گے احباب
مصروف تلاوت انھیں قرآں ملے گا

پھر وقت سحر ہوگا مصلے پہ نمایاں
مصروف دعا خانۂ یزداں میں ملے گا

پھر صبح کو چارہ گر نوع بنی انساں
مصروف علاجات مریضاں میں ملے گا

دوپہر کو وہ مرد خدا تم کو مکاں میں
تدوین کتب حکمت یوناں میں ملے گا

سہ پہر کو پاؤ گے اسے درس میں مصروف
اصحاب سخن سنج و سخن داں میں ملے گا

پھر شام کو وہ رند خرابات محبت
وارفتۂ جاں محفل خوباں میں ملے گا

اور جمعہ کو مل جائے گا گر وقت مشاغل
مصروف عمل خدمت انساں میں ملے گا

دیکھو گے اگر اس کو حقیقت کی نظر سے
ڈوبا ہوا وہ بحر عرفاں میں ملے گا

جب دیکھو گے پاؤ گے اسے محو تمنا
کھویا ہوا جذبات کے طوفاں میں ملے گا

القصہ اسے دیکھو گے بے جان کسی دن
یا اس کا نشاں شہر خموشاں میں ملے گا

جو مست ہے خوشبوئے مدینہ کے اثر سے　　کیا لطف اسے سنبل و ریحاں میں ملے گا

پھر بعد فنا ہو گی اگر اس کی ضرورت
تاریخ کے اوراقِ پریشاں میں ملے گا

وفات:-

حکیم ہادی رضا ماہر جو منبع الطب طبیہ کالج کے نگراں تھے اور ہیضہ کے علاج کے ماہر۔ بسلسلہ منبع الطب طبیہ کالج رام پور گئے تھے۔ ہیضہ کا خود شکار ہو کر بریلی شریف اپنے برادر خورد حکیم حبیب رضا کے پاس گئے۔ مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی۔ آخر ۲۰ جون ۱۹۴۳ء کو داغ مفارقت دے کر معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ میت لکھنؤ لا کر حیدر گنج کے شہرِ خموشاں جو ان کی ننہالی قبرستان ہے۔ تدفین ہوئی۔

انھوں نے خود عرض کیا تھا۔

ماہر فن ہادی را: طبابت چل دیا
درحقیقت معنی لفظ محبت چل دیا

ان کے انتقال پر ان کی طب کی درسگاہ کے شاگردِ رشید حکیم مشتاق احمد خاں غبار بارہ بنکوی نے نذرانۂ عقیدت کے جو پھول اشعار کی شکل میں نذر کئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اے سید فن طب اے مولوی ہادی رضا　　زندہ جاوید ہے ایثار تیرا مرحبا

اے ہمہ معصومیت اے ساکن دار السلام　　خدمت اقدس میں تیری عرض کرتا ہوں غبار

دیکھ کر تیری شبیہہ پاک بھر آتا ہے دل　　ہر ادا میں پا رہا ہوں ایک جذب مستقل

دور رس ہوتی ہے ہر عامی سے شاعر کی نگاہ　　کر رہا ہوں قلب میں محسوس لطف بے پناہ

مرگ تیری اک مقدس زیست کی تفسیر ہے　　اللہ اللہ کس قدر منہ بولتی تصویر ہے

شاہکار زندگانی تیرے یوں بیدار ہیں　　مرگ میں بھی تیری گویا زیست کے آثار ہیں

اے مقیم خلد ہاں اے جادہ پیمائی فنا　　ہر قدم پر دیکھتا ہوں تیرے آثار بقا

ظلمتیں جب ہوں سواد شام میں پرچم کشا　　کاکل شب میں ہو جب افشاں ستاروں کی ضیا

شرق سے ہونے لگے نورِ سحر جب ضوفشاں
جب ہوائے صبح سے مرجھائے شامِ گلستاں

جب کہ آنکھوں میں ستاروں کے خمار آنے لگے
تا کہ جب شب کی زلفِ مشکبار آنے لگے

خوشۂ انگور کا ہو جب ثریا پر گماں
چاندنی کا کھیت جب بن جائے کشتِ زعفراں

کروٹیں لیتی ہو جب سبزے پہ موجِ آب جو
جب شعاعیں چوس لیں سبزے کی نبضوں کا لہو

لمحہ لمحہ یوں ہی ہستی کا تغیر خیز ہے
انقلاب تازہ ہر شے کے لئے مہمیز ہے

اس کشاکش سے مگر برتر ہے اب تیرا مقام
تیری فطرت اب نہیں ہے اس تغیر کی غلام

نورِ عالم سے یکسائے روز و شب صبح و شام
آ رہی ہے قلب کے اعماق تک تیری ضیاء

وہ تیرا روئے منور وہ تیرا حُسنِ جبیں
آرزو کی انجمن میں گویا ہے شمعِ مبیں

زیبِ پیشانی ہیں یونہی داغہائے ضوفشاں
جس طرح اوراق مصحف پر ہوں سجدوں کے نشاں

وہ خمِ محرابِ ابرو اور وہ مژگاں دراز
ترک ہوں جس طرح سے صف بستہ از بہرِ نماز

کون کہہ سکتا ہے وہ تصویر اب بے جان ہے
ہر ادا میں جس کی تازہ زندگی کی شان ہے

منبع الطب تیرے جو بھی فیض سے سیراب تھا
اس کا گوشہ گوشہ رشکِ جنت شاداب تھا

تیرے امکانی مساعی ہر طرح تھے آبیار
دم قدم سے تیرے یہ کالج رہا رشکِ بہار

چل بسا ہاں چل بسا لیکن کچھ ایسا کر دیا
طبِ یونانی کو اعجازِ مسیحا کر دیا

اے خوشا وقتیکہ ہو اس پر نگاہِ لطفِ یار
خاک پائی رہروان ہے جب کہ یہ مشتِ غبار

پسماندگان :-

ان کی شادی ۱۹۱۲ء میں خواجہ امیر شاہ تحصیلدار کی دختر رزاقی بیگم سے ہوئی تھی۔ جس سے تین صاحبزادیاں (۱) آفاق جہاں بیگم۔ (۲) جہاں آرا بیگم (۳) عصمت جہاں بیگم اور دو صاحبزادے حکیم صابر رضا ادیب اور بریگیڈیر محمد شاہد رضا تولد ہوئے۔

تصانیف :-

ذیل کی کتب آپ کی وسعتِ معلومات زورِ قلم اور کثیر تجربات تحریری و تاریخی ہیں۔ جن کو اطباء نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بعض تو دو بارہ و سہ بارہ شائع ہوئی ہیں۔

قرابادین رضائی فارسی :-

یہ قرابادین آپ نے ۱۹۰۷ء میں مرتب کی تھی جس میں بہترین ۵۰۰ یا پانچسو مرکبات مع حل لغات موجد وصانع اوّل مرکب کا نام اور اس کی وجہ تسمیہ بحوالہ کتب طبیہ بحروف تہجی درج کیے گئے ہیں۔ اوزان بجائے عربی کے جو مروج تھے اس وقت مثقال ورطل کے رتی و ماشہ کے لکھے ہیں اور آخر میں اوزانِ طبی عربی۔ فارسی ہندی۔ ایرانی۔ ترکی یونانی۔ ویدک۔ ڈاکٹری وغیرہ تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔

۲۔ القانون فی علاج الطاعون :-

حکیم ہادی رضا ماہر نے یہ رسالہ اپنے والد ماجد کی خواہش پر ترتیب دیا تھا۔ مرض طاعون کے تمام متعلقات کو اس حسن وخوبی سے قلمبند کیا ہے جس کی کوئی دیگر نظیر نہیں ملتی ہے۔

آل انڈیا یونانی و وید ک کانفرنس منعقدہ رام پور ۱۹۱۶ء اس کو نہ صرف اجمل خاں بلکہ دیگر مشاہیر فن طب نے پسندیدگی کی سند دی تھی۔ اور شفاء الملک حکیم اجمل خاں کے اس سند پر دستخط بھی ہیں۔

۳۔ القول الکامل فی ذخیرالحق والباطل :-

اس رسالہ میں زخیہ (پیچش) کے تمام اختلافی مسائل مع فنی نکات اسباب وعلاج وعلامات بامحاورہ سلیس عربی میں تحریر کیا ہے۔

۴۔ قانونِ مطب :-

اس رسالہ میں تمام قوانین مطب واصولِ طب کو جن کا تعلق خاص کر مطب سے ہے بڑی قابلیت سے تحریر فرمایا ہے۔

۵- اصطلاحات الاطباء :-

جس میں اطباء قدیم کے تمام اصطلاحات بڑی خوش اسلوبی سے تحریر فرمائے ہیں۔

۶- عجائبُ المفردات :-

اس میں ان جڑی بوٹیوں کا ذکر ہے جن کا موجودہ کتب میں پتہ نہیں چلتا ہے اور جو اپنے اثرات میں تیر بہدف ہیں۔

۷- الحیات :-

ایک زمانے میں لکھنؤ میں طاعون کا بڑا زور تھا۔ سینکڑوں موتیں اس موذی مرض میں ہو گئی تھیں۔ حکیم صاحب نے الحیات نام کی ایک ڈبیہ ایجاد کی تھی اس ڈبیہ کی خوبی یہ تھی کہ جو شخص اس ڈبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتا تھا وہ طاعون سے محفوظ رہتا تھا۔

جون ۱۹۳۳ء میں الطبیب کے نام سے لکھنؤ سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔ اور جو چند سال جاری و ساری رہا۔

غرضکہ آج جبکہ نہ وہ خود ہیں نہ وہ زمانہ اور نہ وہ ارباب زمانہ تاہم ان کی یاد ان کے کلام ان کی تصانیف سے باقی ہے اور جب کبھی ان کا ذکر آتا ہے تو ان کے مذکورہ اشعار بھی یاد کو تازہ بنا دیتے ہیں۔

قومی و ملی خدمات نیز تحریکِ آزادی میں تعاون :-

ملک کی جدوجہد آزادی سے بھی حکیم ہادی رضا ماہر کا قریبی تعلق رہا تھا۔ "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے زمانے میں ایک موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو جب لکھنؤ آئے تو حکیم ہادی رضا نے ان کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کی ایک تصویر نہ صرف جنگِ آزادی کے مجاہدین

کی یاد دلاتی ہے بلکہ روزِ روشن کی طرح اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے کہ جنگِ آزادی میں اطباء کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

صوبۂ پنجاب میں مجاہدینِ آزادی پر ہو رہے، مظالم سے متاثر ہو کر انھوں نے جو اشعار کہے تھے وہ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ان کے دل میں تحریکِ آزادی کی تڑپ کتنی شدید تر تھی۔

وہ نظم جو انھوں نے پنجاب کے مجاہدین کے لئے کہی تھی درج ذیل ہے۔

بازآیا دیکھ لی حالت تری سرکار کی — حق طلب کرنے پہ جس نے قید کی بھرمار کی
گر یہی حالت رہی اس شوخیٔ رفتار کی — جوش میں آجائے گی رحمت مرے غفار کی
شانتی و قید خانے بازوئے سوراج ہیں — کیا ضرورت توپ کی بندوق کی تلوار کی
جور سے پنجاب ہے مجروح سارا ہندوستاں — ہے دوا سوراج ہی اس وقت کے بیمار کی
معتدل فتویٰ کی ضبطی کم نہیں قرآن سے — جان ہی لیوا ہے جو ہے بات دل آزار کی
گولہ باری یاد ہے ظلم و ستم بھولے نہیں — کیا قیامت خیز ہے حالت مری سرکار کی
جان دینے قید ہونے کو تو خود حاضر ہیں ہم — دین و ایماں چھین لیں یہ کب مجال اغیار کی
مارشل لا کی ضرورت کیا کہ اہلِ ہند کی — گردنیں مشتاق ہیں خود آج کل تلوار کی

سر سے اب آب مظالم بڑھ چلا ہے اس قدر
کوئی دن میں ڈوبتی ہے آبرو سرکار کی

جوشِ تحریکِ آزادئ ہند سے اس وقت شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو متاثر نہ ہوا ہو تحریکِ خلافت تحریکِ ترکِ موالات غرضکہ کوئی بھی تحریک رہی ہو اطباء کبھی بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔ اسی طرح تحریکِ خلافت میں بھی حکیم صاحب نے صرف زبانی حصّہ نہیں لیا بلکہ بڑھ چڑھ کر تعاون دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ کے دنوں میں مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا۔

یارب کرم کہ حد سے فزوں ہے غم والم
بدنام و خوار امتِ خیرالانام ہے
اسلام دردمند مسلماں ہیں مضطرب
نرغہ میں دشمنوں کے ہمارا امام ہے

ہے تیرے ہاتھ دولتِ عثمانیہ کی لاج
دشمن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہستی تمام ہے

طلباءِ طب سے شفقت:۔

حکیم ہادی رضا اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور اس قدر دل لگا کر محنت و محبت سے ان کو درس دیتے تھے کہ طلباء ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ حکیم ہادی رضا خاں منبع الطب کالج میں قانون شیخ کا ایک اہم مسئلہ طلباء کو سمجھا رہے تھے۔ ۲ گھنٹہ مسلسل کتاب میں موجود ایک مسئلہ پر لیکچر دیا۔ دوسرے دن پھر وہی بحث چھیڑ دی اور تیسرے دن اس مسئلہ پر پھر تقریر شروع کر دی۔ جب سب طلباء چلے گئے تو ان کے صاحبزادے حکیم صابر رضا ادیب جو تینوں دن کی بحث پر موجود تھے۔ اپنے والد محترم سے دریافت کیا کہ قبلہ ایک مسئلہ کو سمجھانے میں آپ نے تین دن لے لئے۔ حکیم ہادی رضا نے فرمایا کہ بیٹا یہ طلباء بہت دور دور سے تحصیل علم طب کے لئے میرے پاس آئے ہیں میرا فرض ہے کہ میری جو ناقص معلومات اس مسئلہ سے متعلق ہیں ان کو سمجھا دوں۔ اگر درس دینے میں میں بخل کر دوں گا تو یہ بیچارے کس سے اور کہاں سے علم حاصل کریں گے۔ اس محبت اور خلوص کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے پڑھائے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار اطباء نہ صرف یوپی میں بلکہ بنگال اڑیسہ مدارس۔ آندھرا پردیش صوبہ سرحد افغانستان قندھار اور بخارا تک موجود ہیں جن میں سے بعض تصنیفی اور معالجاتی حیثیت سے ملک میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

حکیم ہادی رضا اپنی فنی مہارت بہترین تشخیص علاج و معالجہ نیز خداداد ذہانت کی وجہ سے لکھنؤ کے اطباء میں حاذق طبیب مشہور ہو گئے تھے آپ ایک بہترین مقرر تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں آپ کی جامع اور مدلل تقریریں سن کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے آپ گھنٹوں تقریریں کرتے مگر زبان پر لغزش نہیں ہوتی تھی۔ آپ فارسی اور پشتو زبانیں بہت روانی سے بولتے تھے۔ چنانچہ افغانستان

کی جانب سے بہت سے افغانی طلبہ آپ سے طب کی تعلیم حاصل کرنے لکھنؤ آتے تھے۔

طبّی و غیر طبّی معرکے :۔

لکھنؤ حاذق اطبّاء کا مرکز رہا ہے۔ لیکن ایسے طبیبوں کی تعداد بہت کم رہی ہے جن میں طبّی حذاقت اور جراحی کا کمال دونوں جمع ہوں خاندان عزیزی کے اہم رکن حکیم عبد العزیز نے اس کمی کو بہت شدّت سے محسوس کیا تھا اور شفاء الملک حکیم عبد الرشید اور شفاء الملک حکیم عبد الحمید کو باقاعدہ سرجری کی تعلیم دلوائی۔ ان دونوں نے سینکڑوں چھوٹے بڑے آپریشن کئے اور سرجری کو مستقل اپنی پریکٹس کا جز بنائے رکھا۔ خاندانِ رضائی اور حکیم عبد الحلیم کے کالج میں بھی یہ امتیاز قائم رہا۔

حکیم صاحب ایک ماہر سرجن بھی تھے :۔

حکیم ہادی رضا کو معالجہ کے علاوہ سرجری سے خاص دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں اپنا مطب شروع کرنے کے بعد انھوں نے سرجری کی جانب کافی توجہ دی تھی لکھنؤ میڈیکل کالج میں انھوں نے ایک انگریز سرجن ڈاکٹر کے ساتھ کافی آپریشن کرکے کافی مہارت حاصل کرلی تھی۔

اپنے مطب میں سرجری کا ایک شعبہ بھی قائم کیا تھا اس میں آپ روزانہ کئی کئی آپریشن کیا کرتے تھے۔ اور منبع الطب کالج کے طلباء کو عملی طور پر سرجری کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ آج بھی یونانی اسپتال میں ایک فوٹو موجود ہے جس میں حکیم ہادی رضا ایک مریض کی آنکھ کا آپریشن کر رہے ہیں۔ حکیم صابر رضا اور دیگر طلباء طب اس فوٹو میں آپریشن دیکھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

حکیم صاحب کو آنکھ کے آپریشن کا خاصہ تجربہ تھا اور دور دور دراز سے مریض آنکھ کے آپریشن کے لیے آتے تھے۔

ٹانگے والے کا ہاتھ کاٹا گیا :۔

ایک دن ایک ٹانگہ والا خون میں لت پت حکیم ہادی رضا کے دواخانہ لایا گیا اور حکیم صاحب کو بتایا گیا کہ اس کے گھوڑے نے غصّہ میں آکر اس کا ہاتھ چبالیا

حکیم صاحب نے ٹانگے والے کا ہاتھ بغور دیکھا اور پایا کہ اب ہاتھ کام کا نہیں رہا اگر اس کو جلدی بدن سے الگ نہیں کیا گیا تو ٹانگے والے کے بدن میں زہر پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ گھر والوں کی مرضی سے حکیم صاحب نے اسی وقت ٹانگے والے کو بیہوش کر کے بہت صفائی سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ یہ کٹا ہوا ہاتھ بہت دنوں تک ایک شیشہ کے بڑے کنسٹر میں حکیم صاحب کے مطب میں رکھا رہا۔ اور اس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے رہتے تھے۔ حکیم صاحب کے آپریشن روم میں ہزاروں روپئے کے قیمتی جرمنی کے بنے ہوئے سرجری کے اوزار تھے حکیم صاحب کو انگریز اعلیٰ حکام کی جانب سے کوکین۔ مارفیا۔ کلوروفارم جیسی خطرناک دواؤں کے رکھنے کی باقاعدہ اجازت تھی۔ آج بھی ان کے ورثاء کے پاس یہ سارٹیفیکٹ جو انگریز سول سرجن نے دیا تھا اور مذکورہ دوائیں استعمال کرنے کی اجازت دی تھی محفوظ ہے۔

مرضاء سے ہمدردی اور محبت :۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ ایک دن حکیم محمد ہادی رضا خاں مطب میں مریضوں میں بہت مشغول تھے ان کے ایک پرانے مریض مرزا صاحب حیران و پریشان آئے اور حکیم صاحب سے عرض کیا۔ قبلہ میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے اس کو آپ ابھی ملاحظہ کرلیں۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب مرزا صاحب کے ساتھ پہونچے۔ مرزا صاحب کا مکان مطب سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ حکیم ہادی رضا صاحب نے واپس آکر اپنے صاحبزادے حکیم محمد صابر رضا سے جو اس وقت مطب میں موجود تھے کہا کہ بیٹا ایک پیالہ بکری کے شوربے کا جلد انتظام کرکے مرزا صاحب کو دے دو۔ حسب حکم والد صاحب کے حکیم محمد صابر رضا ادیب نے اس کا انتظام کردیا۔ جب مطب سے مرضاء اور طلباء چلے گئے تو حکیم محمد ہادی رضا کے استفسار پر کہ مریض کے گھر کھانا بھجوانے کی کیا ضرورت پیش آئی تو انھوں نے فرمایا بیٹا تم نہیں جانتے۔ میں مرزا صاحب کی جس لڑکی کو دیکھ کر ابھی آیا ہوں وہ ٹی بی کی مریضہ ہے اور چند گھنٹوں کی مہمان۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حکیم صاحب میں کیا کھاؤں تو میں نے اس کو بکری کا شوربہ

چپاتی کھانے کو بتایا۔ اس نے کہا کہ حکیم صاحب میں بکری کا شوربہ آپ کے گھر کا کھانا چاہتی ہوں۔
اگر آخری وقت میں اس کی خواہش پوری کردوں تو میرا کیا نقصان ہے۔ اسی طرح حکیم ہادی رضا خان اکثر و بیشتر غریب غرباء کی فیس تک واپس کردیا کرتے تھے۔

تذکرہ حاضر دماغی کا:۔

حکیم صاحب مزاجاً انتہائی خلیق اور جری واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ یوپی کے آخری انگریز گورنر مسٹر ہیلیٹ نے ۱۹۴۲ء میں طب کو درپیش مسائل پر گفتگو کے لئے بلایا۔ حکیم ہادی رضا وقت مقررہ پر گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ گورنر صاحب نے دیر تک حکیم ہادی رضا سے خوشگوار ماحول میں بات چیت کی۔
دوران گفتگو حکیم صاحب کو گورنر صاحب کو انگریزی میں کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش آگئی۔ حکیم صاحب کے انگریزی بولنے پر گورنر صاحب نے حکیم صاحب سے دریافت کیا۔
"ول حکیم صاحب آپ کتنی انگریزی جانتا ہے" حکیم صاحب نے برجستہ جواب دیا۔
"ول صاحب آپ جتنی اردو جانتا ہے"
حکیم صاحب کا یہ جواب سن کر گورنر صاحب بہت خوش ہوئے اور حکیم صاحب سے ہاتھ ملا کر دیر تک ہنستے رہے۔

علامہ حکیم احمد حسین عثمانی

۱۸۹۵ء — ۱۹۳۲ء

بانئ طبی درس گاہ

دنیا میں ایسے لوگ گنتی کے ہیں جنھوں نے اپنی راہ خود بنائی ہو۔ جس طرح دنیا میں ۳ طرح کی اولادیں پائی جاتی ہیں۔ سپوت۔ پوت۔ اور کپوت۔
سپوت وہ جو اپنے والدین سے زیادہ نام کمائے۔
پوت وہ جو اپنے والدین جیسا ہی ہو۔
کپوت وہ جو اپنے والدین سے کمتر حیثیت کا ہے۔
حکیم احمد حسین کا شمار درجۂ اوّل یعنی سپوت کے زمرہ میں آتا ہے۔

خاندان :۔

آپ کے اجداد کسی وقت میں ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے اور بعد میں الہ آباد کے قریب سید سراواں جو طبقۂ سادات اور شرفاء کی بستی ہے وہاں قیام کیا۔
آپ نسباً عثمانی خاندان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی بدرالدین سید سراواں کے جانے ومانے رئیس تھے لیکن گردشِ زمانہ اور حالاتِ وقت کا شکار ہو کر بسلسلۂ ملازمت الہ آباد آکر مقیم ہو گئے تھے۔

بانیِ کالج الہ آباد۔ علامہ حکیم احمد حسین عثمانی صاحب مرحوم

پیدائش :-

آپ کی پیدائش الہ آباد کے مشہور مردم خیز قصبہ جو پچھلے ادوار میں علم و ادب کے میدان میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۲۵ء کو ہوئی تھی۔

تعلیم و تربیت :-

حسب دستور زمانہ آپ کی تعلیم و تربیت کا آغاز اپنے والد کے سایہ عاطفت میں ہوا گھر کی ابتدائی تعلیم کے بعد قصبۂ مذکور میں اردو و فارسی کی تعلیم کی ابتداء کی۔ بعد فراغت تعلیم قصبہ والد ماجد کے نقل مکانی کے ساتھ ساتھ خود بھی ان کے ہمراہ الہ آباد منتقل ہو گئے۔ اور مدرسہ اسلامیہ عربیہ (جو ان کے زمانہ میں تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا) میں داخل نصاب تعلیم ہو گئے۔ بعد فراغت تعلیم مدرسہ آپ نے اپنے وقت کے ماہر تعلیم اور جید بزرگ مشہور عالم و فاضل خان بہادر حاجی حافظ مولوی حکیم صوفی محمد حسین کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور ایک عرصہ تک اصول فقہ۔ حدیث۔ بیان۔ منطق۔ ریاضی وغیرہ درسی کتب دیکھتے رہے۔ مولانا کی مصروفیت بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ کی تعلیم میں حرج واقع ہوتا تھا اس لئے آپ اپنے والد قبلہ کو اطلاع دیئے بغیر بے سروسامانی کی حالت میں کان پور جا پہنچے۔ اور مولوی حاجی حافظ احمد حسین صاحب صدر مدرس دار العلوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چونکہ آپ کی طبیعت ذہین واقع ہوئی تھی اور تکمیل فنون کا شوق تھا۔ اس لئے آپ کی خاص توجہ سے حکیم صاحب مستفید ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں تکمیل فنون کر کے بغرض حصول تعلیم طب لکھنؤ چلے گئے اور راس الاطباء مرخیل اطباء حاذق طبیب حکیم حیدر حسین طبیب دار الشفاء شاہی سے تین سال تک طبی کتابیں پڑھیں اور مطب سیکھا۔ اور نسخہ نویسی کی خوب مشق کی۔ ۱۷۔ ۱۶ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر کلکتہ چلے گئے وہاں مطب کیا اور کامیاب بھی ہوئے لیکن والد ماجد کی علالت

کی بنا پر جب الٰہ آباد آئے تو واپس جانے کو دل نہ چاہا۔ اور الٰہ آباد میں ہی مطب شروع کر دیا۔ چونکہ یہ اپنے والدین کے دوسرے اور آخری صاحبزادے تھے اس لئے گھر کے ساتھ دیگر ذمہ داریاں بھی کاندھوں پر آن پڑیں تھیں۔ چونکہ صاحبِ ذوق تھے اور علم و فہم کے ماہر۔ ذکاوت اور سلیم الطبع بھی تھے۔ طبع نکتہ رس تھی۔ لہٰذا بہت تھوڑے ہی عرصہ میں مطب چل نکلا اور گرد و نواح کے امیر و غریب آپ کے علاج اور حسنِ تدبیر سے فیضیاب ہونے لگے اور چہار سو آپ کی حذاقت بلاغت اور ماہر طبیب ہونے کا شہرہ ہو گیا۔

ہندوستان میں جب طاعون کا زور ہوا تو جہاں دوسرے شہر و قصبے محفوظ نہ رہے وہاں الٰہ آباد بھی لپیٹ میں آگیا اور الٰہ آباد کے بہت سے ڈاکٹر اور حکیم شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تو آپ نے وہاں مقیم رہ کر مرضا کی بہت خدمت کی جس سے آپ وہاں عوام کیا خواص سب میں مقبول ہو گئے اور مطب بہت کامیاب ہوا۔

نہایت ذہین اور باصلاحیت اوصاف کی بدولت دستِ شفا بامِ عروج پر پہنچ کر شہرہ آفاق بنی۔ آپ کو تحقیق اور تدوینِ فنِ طب سے کافی لگاؤ اور خصوصی دلچسپی کے باعث علاج و معالجہ میں آپ کی معجزہ نمائیاں اکثر و بیشتر لوگوں کے زبان زد تھیں اور سینکڑوں اطباء کرام کو بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔ فجر کے بعد سے ظہر تک آپ کا مطب نہایت ہی کامیابی سے جاری اور مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ آپ کے زمانہ طبابت میں مریضوں کی قسمت کا فیصلہ عموماً کم فہم عطاروں کے ہاتھ میں تھا اور غرباء کے علاج کا کوئی طریقہ نہ تھا چنانچہ اس نظریئے کے تحت علامہ موصوف نے یونانی دواخانہ الٰہ آباد کی داغ بیل ۱۲ ۱۹ء میں ڈالی۔ اس دواخانہ نے آپ کی حیات میں ہی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی اس کے ساتھ موصوف نے یونانی دواخانہ پریس الٰہ آباد بھی قائم کیا تھا جس کے قیام کا مقصد صرف تدوینِ طب اور ترجمہ ابن خلدون جنگ ہائے صلیبی وغیرہ کی اشاعت تھی۔ اس پریس کا کارنامہ ہے کہ علم القابلہ میں قبالا کی چارٹ ابتدائے زمانہ حمل سے انتہا تک شائع کر کے طبی اداروں کو سپلائی کیا جس کا ایک نسخہ یونانی میڈیکل کالج الٰہ آباد میں آج بھی موجود ہے۔

حکیم مولوی احمد حسین نے ۱۹۰۴ء میں طب یونانی کی ترویج و ترقی کے لئے اپنے آبائی مکان واقع محلہ سبزی الہ آباد میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا جو مختلف مدارج سے گزر کر اس وقت یونانی میڈیکل کالج کی حیثیت سے اپنی زمین اور اپنی بلڈنگ محلہ ہمت گنج الہ آباد میں موجود ہے۔ یہ ادارہ بلا شرکت غیرے موصوف نے اپنی ذاتی جیب سے قائم کیا تھا موصوف نے فن طب کی تدریس کے لئے ہندوستان کے مشاہیر اطباء پر مشتمل ایک جماعت جمعیتہ الاطباء کی تشکیل بھی کی تھی۔ جس کے زیر نگرانی مدرسہ طبیہ بعدہٗ یونانی میڈیکل اسکول کے امتحانات اور نصاب جاری اور قائم کیا تھا۔ عربی داں کے لئے تعلیم خالص عربی زبان میں ہوتی تھی اور چار سال کی فراغت کے بعد ان فارغین کو ماہر الطب والجراحت اور اردو زبان میں طب کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کو چار سال کی مدت کے بعد معتمد الطب والجراحت اسناد عطا کی جاتی تھی۔

یونانی دواخانہ الہ آباد میں موصوف کے زمانۂ حیات سے ہی ایک طرف امراء اور مستطیع حضرات کو اصول طبیہ کے متعلق اصلی دوائیں قیمتاً دی جاتی تھیں۔ دوسری جانب وہی دوائیں نادار اور غریب مریضوں کو مفت دی جاتی تھیں یہی وجہ تھی کہ ان کے بے مثال علاج و معالجہ کے کارنامے اور ایثار سے لوگوں کا خیال تھا کہ باری تعالیٰ نے بنی نوع انسانی کے فائدہ اور فن طب کی ترقی کے لئے خاص طور پر موصوف کو معمور کیا تھا۔ غرباء کی طبی امداد اور فن طب کی ترقی کو علامہ مرحوم نے مقصد حیات بنا رکھا تھا۔ ان کی دیرینہ اور ۳۵ سالہ مسلسل فنی خدمات کے عوض میونسپل کارپوریشن نے اس سڑک کا نام جس پر یونانی دواخانہ ہے حکیم احمد حسین روڈ رکھ دیا ہے۔

۱۹۲۱ء کو موصوف نے خود زمین خرید کر طبیہ کالج کو اس کی زمین میں منتقل کر دیا اور ایک سال بعد اس زمین پر تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کالج کے فارغین کی بہت بڑی تعداد تقریباً ہر صوبے میں پھیلی ہوئی ہے اور کامیابی کے ساتھ مطب کر رہے ہیں۔ اس کالج میں طب قدیم کے ساتھ ساتھ انکشافات جدیدہ سے بھی بقدر ضرورت واقفیت کرائی جاتی رہتی ہے۔

وفات :-

ابھی طبیہ کالج میں تعمیر کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو موصوف نے ملکِ عدم کی راہ لی۔ کالج کے احاطے میں ہی بصد احترام و اعزاز دفن کیا گیا۔
حکیم حسین احمد عثمانی کو فنِ طب سے اس قدر لگاؤ اور رجحان تھا کہ اپنے بعد اپنے دونوں بیٹے اس فن کی جانب لگائے اور دونوں فرزندوں کو طب کی تعلیم سے مالا مال کیا۔
آپ کی وصیت کے مطابق ۱۹۶۱ء تک طبیہ کالج میں تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ غیر مستطیع طلباء کے لئے وظائف بھی مقرر تھے۔ ان کے زمانۂ حیات میں یونانی میڈیکل اسکول میں بڑے بڑے عالم اور جید حضرات جیسے شمس العلماء امجد علی فیلو آف الہ آباد یونیورسٹی۔ ڈاکٹر محمد عظیم فیلو آف پٹنہ یونیورسٹی ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر کل ہند کانگریس۔ ڈاکٹر عنایت اللہ بٹ آئی۔ سی۔ ایس۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں۔ جسٹس گوکھرن ناتھ مصرا۔ ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا۔ ڈاکٹر سر محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے معائنہ فرمایا۔ اور موصوف کی خدمات کو سراہا۔

پسماندگان :-

آپ نے اپنے بعد اپنے لگائے ہوئے درخت کی آبیاری کے لئے دو بیٹے شفاء الملک حکیم احمد عثمانی اور حکیم محمد صفوان عثمانی کو چھوڑا۔

ادبی خدمات :-

اگر آپ نے ایک جانب طبی خدمات علاج و معالجہ و طبی درسگاہ کی حیثیت سے کی ہے تو دوسری جانب تاریخ میں ترجمہ ابن خلدون جو ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے یہ نہ صرف ایک دستاویز ہے بلکہ تاریخی حیثیت سے ایک شاہکار ہے۔ جس میں
جلد اول۔ جو از قبل ولادت نبوی تا شہادت حضرت علی کے بیان میں ہے۔
جلد دوم۔ جو حالات ملوک فارس و یونان وغیرہ کے بیان میں ہے۔

جلد سوم۔ عرب قبل اسلام۔ رسول اللہ کی ولادت تا عہد خلافت کے بیان میں ہے۔
جلد چہارم۔ فتوحات فاروق اعظم کے بیان میں ہے۔
جلد پنجم۔ خلفائے بنی امیہ۔ امیر معاویہ مزید تا واقعات کربلا کے بیان میں ہے۔
جلد ششم۔
جلد ھفتم۔
جلد ھشتم۔ خلافت عباسیہ کے زمانۂ انحطاط کے تاجدار کے بیان میں ہے۔
جلد نہم۔ خلافت عباسیہ کے آخری دور کے گیارہ تاجدار کے بیان میں ہے۔
جلد دھم۔ حاکم یا امر اللہ کی خلافت سے بنو امیہ کے بیان میں ہے۔
جلد یازدھم۔ اندلس کا آخری دور کے بیان میں۔
جلد دوازدھم۔ علاوہ دیگر حکمرانانِ اسلام جاپان۔ ہند۔ نیپال۔ گوالیر وغیرہ کے بیان میں۔
جلد سیزدھم۔ سلاطین غوریہ کے انساب و حالات فتوحیات دہلی۔ بنارس۔ میرٹھ کالپی۔ بدایوں۔ مقابلہ بھیم دیو جے چند۔
جلد چہاردھم۔ سلاطین سلجوقیہ۔ چنگیز خان کا خروج تاتاریوں کا طوفان۔ ممالکِ اسلامیہ کی بربادی۔

ان کی دیگر تصانیف ہیں۔
صلاح الدین۔ سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کی سوانح عمری۔
حیات نور الدین محمود زنگی۔ فاتح شام و جزیرۂ مصر کی سوانح عمری۔
ان کی طبی حذاقت۔ علمی لیاقت فنِ طب کے لئے ایثار قربانی سے متاثر ہو کر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خدمتِ طب کے لئے سب کچھ خدارا دے دیا
حصولِ طب کی خاطر اپنا ادارہ دے دیا
بحرِ طب میں آپ نے گویا کنارا دے دیا
ڈوبتی کشتی کو ساحل کا سہارا دے دیا

آپ کی رائے تھی کہ:

(۱) حصاۃ الکلیہ کے متعلق مخرجات اور مفتتات عام طور پر درسی کتب میں مندرج ہیں۔ یا قرابادینوں میں لکھے ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ منع تحجر اور تولد حصاۃ کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ آپ کی رائے میں مادۂ محجرہ جگر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا انسداد یہیں سے ہونا چاہیئے۔ پہلے منضج استعمال کرائیں۔ بعدہٗ مسہل دے کر مقویات جگر و گردہ و مثانہ استعمال کرائیں۔ اس طرح کے علاج سے انشاء اللہ تعالیٰ تولد حصاۃ و رمل رک جائے گا۔

(۲) ماء اللحم نیز عرقیات میں ثعلب مصری۔ شقاقل مصری طباشیر کبود کا استعمال قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ عرقیات میں ان دواؤں کا استعمال فضول ہے اس لئے کہ جب ادویہ پر غور کیا جاتا ہے تو تین طرح کی دوائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ کہ جن کے افعال اجزائے ارضیہ کے ساتھ ہیں یعنی وہ اجزائے ارضیہ اجزائے لطیفہ ہوائیہ، ناریہ سے اس طرح مثبت ہیں کہ ان کا اڑانا اور جدا کرنا ممکن نہیں۔ منتفع ہونے کے لئے استادوں نے معاجین وغیرہ کی ایجاد کی ہیں نہ کہ عرقیات۔

دوسری وہ دوائیں ہیں جن کے اجزائے لطیفہ اجزائے ارضیہ سے اس طرح اڑائے اور جدا کئے جا سکتے ہیں کہ ان کے اجزائے ارضیہ محض ثقل کی صورت میں رہ جائیں جو مایہ مقصد نہیں۔ ایسی دواؤں کا عرقیات میں استعمال کرنا ادنیٰ و انسب ہے۔

(۳) تیسری وہ دوائیں جن کے اجزائے ارضیہ و لطیفہ دونوں نفع میں تقریباً برابر ہیں۔ ایسی دوائیں ہر طرح سے کام میں لائی جا سکتی ہیں؟ پس جن ادویہ کے محض جرم میں تاثیر موجود ہے اور جن کے اجزائے لطیفہ ان کے اجرام سے منفک نہیں ہو سکتے۔ ان کا عرقیات میں استعمال کرنا بے معنی ہے۔

طبی معرکے :-

ایک بار کا ذکر ہے کہ فیض آباد کے ایک سول سرجن کی اکلوتی لڑکی تھی جو عرصے سے قولنج گردہ بوجہ حصاۃ الکلیہ میں مبتلا تھی۔ آپریشن سے بہت گھبراتی تھی۔ ایک زمانہ تک مختلف معالجین کا علاج ہوتا رہا مگر آرام نہ ملا۔ درد کا دورہ برابر پڑتا

آخر کار اس قدر کمزور اور نحیف اللحم ہو گئی کہ گھر والے ناامید ہو گئے۔ درد کا دورہ ختم ہوا اور نہ پتھری نکلی۔ اس سلسلہ میں موصوف کو الہ آباد میں رجوع کیا گیا۔ حکیم صاحب نے حوالیۂ گردہ کا سب سے پہلے علاج شروع کیا۔ شروع میں تین دنوں تک عرق بادیان دن بھر پلاتے رہے۔ پھر اس کے بعد جوارش شہریاران ایک تولہ کی مقدار میں رات کو سوتے وقت دی گئی۔ تین دن کے بعد اپنا سنگ گردہ کا مجرب نسخہ شروع کیا۔ نسخہ تخم ترب حجرالیہود سنگ سرماہی۔ ہر ایک ایک ماشہ خوب باریک پیس شہد بت کشوث ایک تولہ میں ملا کر چٹائیں۔ اس کے اوپر حب کا کنج ۶ ماشہ تخم حنا ریں ۳ ماشہ۔ پندرہ تولہ پانی میں جوش دیکر چھان کر گل قند آفتابی ½-۲ تولہ ملا کر برابر پلاتے رہیں۔ پندرہ روز کے بعد درد کا شدید دورہ ہوا۔ یہاں تک کہ مریضہ بے ہوش ہو گئی۔ حکیم صاحب طلب کئے گئے۔ موصوف نے کو کنار مسلم د عدد عرق گلاب خالص ایک پاؤ میں جوش دے کر فلالین کے کپڑے کو تر کر کے نچوڑنے کے بعد ٹکور کرانا شروع کیا مریضہ کو بستر پر پیشاب ہو گیا جس میں بڑی مقدار میں ریزے تھے۔ مریضہ کی آنکھ کھل گئی یہ علاج اس وقت جاری رہا جب تک کہ پتھری بالکل نہیں گئی۔ لوگوں کو اور خصوصاً سول سرجن صاحب کو اس علاج سے بڑی حیرت ہوئی۔ علاج تقریباً چھ ماہ چلتا رہا۔ مریضہ دن بدن صحتیاب ہوتی گئی۔

اسی طرح ایک بار صوبہ یوپی میں مرض طاعون بہت شدت سے پھیلا۔ ہزاروں انسان لقمۂ اجل ہو گئے۔ الہ آباد بھی اس مرض کی لپیٹ میں آگیا۔ حکیم صاحب نے ایسے ہی موقع پر الہ آباد ہی میں رہ کر جب کہ شہر کے بہت سے ڈاکٹر حکیم اس خوفناک مرض کے خوف سے الہ آباد چھوڑ چکے تھے مریضوں کا علاج شروع کیا۔

ایسے ہی حالات میں ایک جوان العمر مریضہ جو طاعون میں مبتلا تھی اس کے لئے موصوف نے جدوار خطائی ۹ ماشہ درونج عقربی ایک تولہ مرزنجوش ۲ تولہ کافور ۶ ماشہ زرشک ۹ ماشہ کو کوٹ کر پیس کر چنے کے برابر گولیاں تیار کرائیں اور مریضہ کو شروع میں ۲ عدد دن میں ۲ بار پھر چار دن کے بعد تین کے بجائے دو۔ دو گولیاں دن میں تین بار استعمال کرائیں مریضہ کو شفا ہوئی اور صحت یاب ہو کر بقیہ زندگی اچھی گزاری۔

شہنشاہِ تصنیفات۔ نازشِ طب

علّامہ حکیم کبیرُ الدّین

۱۸۹۴ء ۱۹۷۶ء

تاریخ میں ہمیشہ وہ یادگار ہستیاں باقی رہیں ہیں جو اپنی مساعیٔ جمیلہ سے ایسے کام کر گزری ہیں جو نمایاں رہے ہوں۔ ان قابل ذکر ہستیوں میں حکیم علّامہ کبیرالدین کا نام بھی داخل ہے۔ طبی دنیا میں ان کا نامِ نامی واسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے

اجداد:۔

آپ کے جدِ امجد شہنشاہِ اکبر کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور کاٹھیاواڑ سے صوبۂ بہار منتقل ہو گئے تھے۔ بعہدِ شہنشاہ اکبر ان کے اجداد کو ایک بڑی جاگیر صلہ خدمت کے عوض ملی تھی۔ ان کے والد جمال الدین ایک جانے د مانے ہوئے بزرگ د عالمِ دین تھے۔

پیدائش:۔

علامہ حکیم کبیر آلدین کی پیدائش صوبہ بہار کے مردم خیز ضلع مونگیر کے قصبہ شیخ پورہ محلہ یحییٰ پور میں ۱۸۹۴ء کو ہوئی تھی۔

تعلیم:۔

تعلیم کی ابتدا قاعدہ بغدادی سے وطن کے ہی مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء

میں گیارہ برس کی عمر میں اپنے منجھلے بھائی حکیم محمد ظہور الدین کے ساتھ کان پور میں پہنچے جہاں حضرت مولانا عبید اللہ کان پوری جیسی بے نظیر ہستی کا بچپن ہی میں سایہ نصیب ہوگیا۔ مولانا گو مدرسہ دار العلوم کان پور کے صدر مدرس تھے۔ مگر ازراہ شفقت بزرگانہ گھر پر نام حق۔ پندنامہ۔ عطار۔ گلستاں جیسی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے جس میں ایک گیارہ سالہ بچہ کے ساتھ منتہی طلباء بھی شریک درس ہونا باعث فخر تصور کرتے۔

عربی تعلیم :-

اس کے ساتھ ہی جلد ہی میزان منشعب۔ پنج گنج جیسی کتب بھی شروع ہوگئیں۔ اور صرف و نحو کی مشق اور ابتدائی منطق کی تعلیم کان پور ہی میں مولانا کے زیر سایہ ہونے لگی۔ ۱۹۰۰ء میں دونوں بھائی لکھنؤ پہونچے۔ جہاں منجھلا بھائی تو تکمیل الطب طبیہ کالج میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوگئے اور برادر خورد یعنی کبیر الدین کو شمس العلماء مولانا عبدالمجید فرنگی محلی کی شاگردی نصیب ہوئی جو عربی اور فارسی کی درسی کتب کے نہ صرف قابل ترین استاد تھے بلکہ کیننگ کالج (قیصر باغ) میں شعبۂ علوم و مشرقیات کے اساتذہ میں شامل تھے۔ محنتی و ذہین شاگرد نے اپنے لائق استاد کی توجہ سے درسی کتب پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔

طبی تعلیم :-

۱۹۰۹ء میں جب کہ آپ کی عمر تقریباً سولہ برس تھی آپ علم طب کی تحصیل کے لئے مدرسہ طبیہ (عربی) دہلی پہونچے جو اس زمانے میں گلی قاسم جان میں واقع تھا۔ اور دہلی میں مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت اس طبی مدرسہ میں جو اساتذہ تعلیم دے رہے تھے وہ سب کے سب اپنے فن میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ مولانا حکیم عبدالرشید صاحب رامپوری "کلیات" مولانا حکیم عبدالرحمٰن صاحب پنجابی "معالجات" مولانا حکیم عبدالرزاق

صاحب پیرجی تشریح اور ڈاکٹر امیر حیدر صاحب جدید مضامین کا درس دیا کرتے تھے۔
ان مستقل اساتذہ کے علاوہ حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خان عرف بھورے
میاں صاحب بھی وقتاً فوقتاً بعض مضامین پڑھایا کرتے تھے۔

استاذ کبیر استاذ الاساتذہ حاذق الملک مسیح الملک شفاء الملک حکیم محمد اجمل خاں
بھی اساتذہ میں شامل تھے مگر شعبہ عمل کی حد تک کہ مدرسہ کے طلباء نظری تعلیم سے
فارغ ہونے کے بعد ان کے مطب میں بیٹھ کر اصول علاج سیکھتے تھے۔ استاذ کبیر
اس زمانہ میں کتابی درس نہیں دیتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی دیگر اساتذہ کی طرح مدرسہ
میں آکر درس دیتے تھے۔

چند ہی روز میں اس بیس یا سولہ سال کے نوجوان نے ہم جماعت طلباء اور اساتذہ
کے قلوب میں اپنا مقام حاصل کر لیا۔ طلباء عزت کرنے لگے اور اساتذہ محبت۔
پیرجی عبدالرزاق صاحب ازراہ شفقت اکثر اوقات کبیر الفلاسفہ کے لقب سے
یاد کرتے تھے۔

امتحان کے نتائج ایسے شاندار رہے کہ مشکل سے اس کی نظیر مل سکے۔
ہر سال دونوں مضامین (یونانی و ڈاکٹری) میں برابر اول رہے اور کبھی ہمراہی
کو پیش روی کا موقع نہیں دیا۔ اس طرح مدرسہ طبیہ دہلی سے اول درجہ کے
دونوں تمغے حاصل کیے۔

تمغہ شیو پرشاد بہادر (اول یونانی)
تمغہ شمس الاطباء (اول ڈاکٹری)

رفعت اوج کی تمنا اس نوجوان کو لاہور لے گئی۔ "دور کے ڈھول سہانے"
زبدۃ الحکماء آخری امتحان کا لقب کتنا شاندار ہے۔ سادہ نام کے ساتھ
جب اتنا بڑا لفظ لکھا جائے گا تو کتنا بھلا معلوم ہوگا۔ اسی قسم کے جذبات نوجوانی
نے ان کو اس امتحان کی شرکت کے لئے آمادہ کیا۔

اس وقت لاہور کے اس بڑے طبی کالج میں بدعنوانیاں انتہا کو پہنچ
چکی تھیں۔ حسن اتفاق کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں امتحانات میں اچھی طرح سختی
برتی گئی اور نگران اعلیٰ پروفیسر خواجہ ولی محمد صاحب نے اپنی خداداد جدت نظر

اور قوت نظر کے پورے جوہر دکھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زبدۃ الحکماء اور عمدۃ الحکماء کے امتحانات میں صرف حکیم کبیر الدین کے کوئی بھی حکیم کامیاب نہ ہو سکا۔ درجات میں یہ نہ صرف اکیلے رہے بلکہ اول بھی رہے۔ اس وقت مذکورہ امتحانات کی حیثیت ایسی تھی جیسی کہ آج کل کی طبی تعلیم ایم ڈی ہے۔

اس کامیابی میں سہ ریویٹی ڈین کا تمغہ حاصل کیا اور جب یہ دہلی پہونچے تو حکیم اجمل خاں اعظم اتنے محظوظ ہوئے کہ مدرسہ طبیہ دہلی کی سند اور تمغہ پر نام کے ساتھ "زبدۃ الحکماء" لکھوانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حسن اتفاق سے امسال حکیم حاذق اجمل خاں امتحان "زبدۃ الحکماء" کے ممتحن بھی تھے۔

دیگر علوم :-

زمانۂ قیام ۱۹۰۷ء لکھنؤ میں کبیر الدین نے فن خطاطی کی تعلیم اپنے زمانہ کے نامور اور فن کے ماہر شمس الدین اعجاز رقم سے حاصل کی۔ اور کیننگ کالج میں تعلیم بھی۔

لاہور میں ۱۹۱۴ء میں مندرجہ بالا امتحانات پاس کر لئے تھے اور یہ زمانہ حکیم کبیر الدین کی دور تعلیمی کے ختم ہونے کا ہے۔ وہاں یہ کچھ عرصہ شمس الاطباء حکیم غلام جیلانی کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ یہاں پر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ترجمہ و تالیف کا مشغلہ مل گیا۔ جو طبع عام خوب بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ جو تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا۔ کہ آپ نے لاہور ہی میں مطب اور طبی درس کا اعلان کر دیا یعنی استادی کا درجہ لاہور ہی میں استاد محترم حکیم غلام جیلانی کی رفاقت میں مل گیا تھا۔

ترجمہ کی ابتدا۔ ۱۹۱۶ء :-

لیکن قدرت کو چونکہ کچھ اور منظور تھا اور خدمت فن کا بڑا کام ان سے لینا چاہتی تھی۔ سلسلہ مطب کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ آپ کو شرح اسباب کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا۔ چار جلدوں میں سے دو جلدوں کا برق رفتاری سے

ترجمہ کرکے اور چھپوا کر استاذ کبیر و محسن طب حکیم اجمل خان کی خدمت میں پیش کیا۔ جو حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب تھا۔ اس طرح طبع اول جو ۱۹۱۶ء کا ہے حکیم صاحب سے منسوب ہے۔

اسی زمانہ میں مدرسہ طبیہ کو کالج کے معیار پر لانے کی کوششیں تیزی سے ہو رہی تھیں۔ اور اجمل اعظم کے دماغ میں کالج کی ترقی کے منصوبہ جوش و خروش پر تھے۔ جب رام پور سے واپس آکر جہاں ہدیہ سعیدہ و حقیقہ پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ دہلی میں دوبارہ حکیم کبیر الدین کو حکیم اجمل خاں کے نیاز حاصل ہوئے تو اُستاذِ کبیر حکیم اجمل اعظم کا ارشاد ہوا۔

"جدید تنظیم کے تحت تصنیف و تالیفات کا ایک شعبہ کھولا جا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مؤلف اوّل کی جگہ کام کرو۔"

کیونکہ سعادت مند اور لائق و فائق شاگرد کے اندر چھپی ہوئی طاقت کو استاذِ محترم کی دوربین و دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔

یہ ارشاد نہ صرف واجب التعمیل اور واجب الاحترام بھی تھا بلکہ ایک شاندار اعزاز اور کھلا اعلان کہ اجملؔ اعظم کی جوہر شناس نگاہ میں جوہرِ کبیرؔ کی کیا قدر و قیمت ہے۔

شعبہ تصنیف و تالیفات حسبِ منشا کھلا۔ کھلنے والے کالج کے لئے اگر ایک طرف قرول باغ میں اینٹ اور پتھر سے عمارتیں بن رہی تھیں تو دوسری جانب علمی بنیادیں بھی جا رہی تھیں۔ یعنی عربی زبان میں نصاب کی کتب تحریر کی اور کرائی جا رہی تھیں۔

علامہ حکیم کبیر الدین کے ذمہ سب سے پہلا تحریری و تصنیفی کام جو دیا گیا تھا وہ کام ایک کتاب فنِ تمریض یعنی تیمارداری تفویض ہوا تھا جو حکیم کبیر الدین نے اپنی سخت جاں فشانی محنت سے دس ماہ ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد حکم ملا کہ نصابِ تشریح کے لئے ایک جامع کتاب عربی ہی میں معلوم تالیف کی جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تشریح کا بہت بڑا حصہ لکھا گیا۔ تشریح کا یہ مسوّدہ تو زیورِ طباعت سے سج نہ سکا۔ وقت کے تقاضوں کے تحت

نصاب تعلیم اور حکیم اجمل خاں کے خیالات اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اور سرکاری زبان اردو ہونے کی بنا پر اردو کی جانب راغب ہوگئی لہٰذا یہ عربی کا مسودہ آگے چل کر اردو قالب میں ڈھل کر تشریح کبیر کا بنیادی مواد بن گیا۔

خدمت تعلیم:

شیخ الشیوخ پیرجی عبدالرزاق صاحب کے انتقال پُر ملال پر اجمل اعظم خان مناسب استاد کی تقرری کے لئے از حد فکر مند تھے آخر اس مشکل مرحلے کے لئے قرعۂ فال علامہ حکیم کبیرالدین صاحب کا انتخاب صحیح تھا۔

پیرجی شیخ عبدالرزاق سے پہلے تشریح کا مضمون ڈاکٹروں کے ذمہ پڑھانے کی ذمہ داری تھی۔ یہ پہلے طبیب تھے جنھوں نے نہ صرف خود اس کالج میں علم تشریح پڑھائی بلکہ ایسے شاگردان رشید کی ایسی پوری ٹیم تیار کردی جو آج بھی مختلف کالجوں میں نہ صرف علم تشریح پڑھاتے بلکہ تشریح کی کتابیں بھی تحریر کر رہے ہیں۔

اس زمانے میں تشریح کی دوہری کتب پڑھائی جاتی تھیں۔

تشریح قدیم (عربی زبان میں)

تشریح جدید (اردو زبان میں)

اس پڑھائی سے طلباء کے دماغ میں کیسی کیسی الجھنیں۔ وسوسے اور خیالات پیدا ہوتے ہوں گے اس تلخی اور بدمزگی کا اندازہ صرف پڑھنے اور پڑھانے والوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ حکیم کبیرالدین نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے تشریح کبیر جیسی کتاب کی تصنیف کی۔ تشریح کبیر کے چھپنے کے بعد جدید و قدیم تشریح الگ الگ پڑھانے کی ضرورت نہیں رہی اور جدید و قدیم تشریح کا فرق مٹ گیا کیونکہ اس کے قبل ایسی کوئی کتب بازار میں نہ تھی۔

تشریح جیسے مضمون کا تمامتر اپنی اصطلاحات میں پیش کرنا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس زمانے میں آسانی سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس کام نے ترجمہ کے فن کو نیا قالب دے دیا اور طبی دنیا کو یہ احساس پیدا کرا دیا کہ ڈاکٹری کتب کے تراجم اپنی اصطلاحات کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف شرط محنت اور ہمت کی ہے۔

ان کی علم تشریح پڑھانے کی کامیابی سے متاثر ہوکر ذمہ داران طبیہ کالج نے کچھ عرصہ کے بعد علامہ کو علم فزیالوجی (منافع الاعضاء) کی تعلیم طلباء طبیہ کالج کو پڑھانے کی سپرد کردی۔ درس و تدریس میں علامہ نے وہ جوہر دکھائے کہ تمام طلباء آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ علم تشریح میں کامیاب تصنیف و تالیف کے بعد اسی عہد و پابندی کے ساتھ انوکھے اور نئے مضمون منافع الاعضاء پر قلم اٹھایا اور شاہکار تصنیف منافع کبیر کے نام سے ترتیب دی۔

اب وہ مبارک ساعت آگئی جو طبی دنیا کے لئے بشارت کبریٰ کا درجہ رکھتی تھی یعنی مدرسہ طبیہ کرایہ کے بوسیدہ مکان سے نکل کر قرول باغ کی عالیشان عمارت میں منتقل ہوگیا۔ اور حکیم اجمل خاں جو قومی یکجہتی کی علامت تھے ان کی وسعت قلبی سے ایسے کالج کی بنیاد پڑی جہاں آیورویدک اور یونانی طب کی تعلیم کے لئے مخلوط درسگاہ "آیورویدک و یونانی طبی کالج" کے نام سے کھولا گیا جس کی اگر بنیاد لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھوں رکھی گئی تو افتتاح باپو مہاتما گاندھی کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔

دہلی کا مشہور طبی رسالہ "مجلہ طبیہ" جس میں مدرسہ طبیہ کی ترقی نیز معلومات طب کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ پرچہ عبدالرزاق کے انتقال کے بعد بند ہوگیا تھا۔ لہذا پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالہ جاری کیا جائے جس میں نہ صرف طبی خبریں ہوں بلکہ طبی کالج کا ترجمان بھی ہو۔

۱۹۲۱ء میں "المسیح" کے نام سے ایک طبی جریدہ نکالنا شروع کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوجانے کے بعد چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر بند ہوگیا۔ ان کے ادارہ المسیح سے بعد میں بہت سی نصابی کتب بھی شائع ہوئیں جس نے ہماری درسی ضرورتوں کو بڑی حد تک پورا کردیا۔ طبیہ کالج کے سند یافتہ اس ادارہ کی بنا پر حکیم کبیرالدین کے نام سے بخوبی واقف اور کتب کی فراہمی کے لئے ان کی خدمات کے معترف بھی ہیں۔

طبیہ کالج کی شکل میں مدرسہ طبیہ کے منتقل ہونے اور قرول باغ کی نئی عمارت میں آجانے کے بعد علمی قوتوں میں ظاہر ہے کہ ایک نیا جوش پیدا ہوگیا۔ تشریح و منافع کی کتب تیار ہوچکی تھیں کہ اسی طرز پر جراحت کی کتاب بھی لکھی جائے جس کے

ذمہ دار ارکان ادارہ نے حکیم کبیرالدین ہی کا انتخاب کیا۔ جراحت کی کتاب کی تدوین وتالیف میں حکیم کبیرالدین نے اپنے مخلص دوست ڈاکٹر محمد عثمان خاں (ایم او ریاست بڑودا) جو بعد میں وابستہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں داخل ہو گئے تھے) کو بھی اپنے اس کام میں شریک کر لیا تھا۔ گو اس کتاب کا بڑا حصہ جدید علم جراحت کا ترجمہ ہے مگر اصطلاحات کے طویل و عریض مرحلۂ خارزار کو جس انداز میں پہلی بار کامیابی سے طے کیا تھا وہ صاحب تصنیف وتالیف کے لئے قابل توجہ ہے۔ تشریح منافع اور جراحت کی کتب کیا تیار کیں کہ میدان کھل گیا اور ترجمہ تصنیف وتالیف کے لئے ایک صاف ستھری اور سیدھی شاہراہ بن گئی۔

تشریح منافع اور جراحیات جیسے موضوعات پر اس کے قبل بھی آگرہ اور اردو مرکز لاہور میں کتب تحریر کی گئی تھیں لیکن حکیم کبیرالدین جیسی تیار کردہ آسان و عام فہم کتابیں نہ تو کسی نے تحریر کی تھیں نہ ترجمہ اور نہ ہی مرتب کی تھیں۔ ۱۹۲۵ء تک طبیہ کالج کے لئے نصابِ تعلیم تیار ہو چکا تھا۔ جس میں قدیم و جدید دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔

اس عظیم کام سے فراغت کر کے اس سے بھی زیادہ اہم کام اصلاح نصاب کی جانب توجہ دی گئی جس کی جانب المسیح روزِ اول ہی سے زور دے رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں اس علمی مجلس کی تشکیل ہوئی اور دہرہ دون و منصوری کے درمیان واقع قصبہ راج پور میں طب یونانی کے عظیم رہنما حکیم اجمل خان کی نگرانی میں اس کام کی ابتدا کی گئی۔ جو طب یونانی کی تاریخ کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے اجمل خان نے ایک تحریر اپنے خود ہاتھ سے تحریر کی جو معاہدہ اجمل کے نام سے منسوب ہے۔

اس عہد نامہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ہم نے آج ۲ جولائی ۱۹۲۶ء کو جمعہ کے دن "اصلاح طب" کا کام جو حقیقت میں یونانی طب کے لئے بمنزلہ اساس کے ہے شروع کیا اور ہم خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نیک کام میں مدد دے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس جلیل القدر خدمت کو اپنی استطاعت کے مطابق برابر انجام دیتے رہیں

رہیں۔

اجمل

فضل الرحمٰن　　　محمد الیاس خاں　　　محمد کبیر الدین

عبدالحفیظ　　　سید ناصر عباس

اس معاہدہ نامہ پر نہ صرف اپنے دستخط ثبت کئے۔ بلکہ پہلے ثبت کئے۔ اس کے بعد دوسرے اراکین مجلس سے ارشاد ہوا کہ وہ وصیت اجملی پر دستخط کرکے حیات کے آخری لمحات تک اس علمی عہد و پیمان کے پابند ہو جائیں۔

۱۹۱۶ء میں حکیم کبیر الدین نے المسیح نام کا جو ادارہ طبی کتب کی فراہمی کے لئے قائم کیا تھا، اس میں حکیم محمد عبدالواحد حکیم محمد صدیق، حکیم سید محمد یوسف نیّر حکیم حبیب اللہ شامل تھے۔ جنھوں نے المسیح سے کئی کتب شائع کرائیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان کتب میں ایک تاریخی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف ناشر کا نام ہے مصنف مرتب یا مؤلف کا نام نہیں ہے۔

مذکورہ معزز عہدنامہ جو حکیم اجمل خان سے ہوا تھا اُن قوتوں کو تیز تر کر دیا جو پہلے ہی سے محرک تھیں۔ اب حکیم کبیر الدین کے تراجم و تالیفات میں اصطلاح فن اور تجدید و احیاء کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔ تھوڑے دنوں میں انھوں نے تصنیفی میدان میں ان گم گشتہ رازوں کو آشکار کرنا شروع کر دیا جو مخفی تھے۔ مگر اہل فن کی نظروں سے اوجھل اور دور تھے لیکن اہل نظر اسے سن کر یا پڑھ کر اسے نئے انکشافات کا نام دیتے اور بہ نظر استحسان اس کا استقبال کرتے جیسے اخلاط کا نظریہ۔ دوران خون کا مسئلہ قلب کی کواڑیاں یا کان کی ہڈیوں دعضلات ... کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

اس طرز خدمت سے فن میں ایک نئی شان پیدا ہوگئی۔ اطباء کی مرعوب ذہنیت کا خاتمہ ہونے لگا فن کو ایک نئی شان ملنے لگی اور اس طب پر جو چہار جانب سے جا و بیجا حملہ ہونے لگے تھے ان سے محفوظیت ہونے لگی۔

حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد شریف منزل میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی جس کی بنا پر طبیہ کالج بھی اس زد میں آگیا اور خاندان شریفی کی ہر چیز تباہ ہونے لگی۔

اس دورِ تباہی میں حکیم کبیرالدین جیسے قدیم خادمِ گذاروں کی خدمت سے طبیہ کالج محروم ہو گیا۔

جن لوگوں نے حکیم اجمل خان سے اصلاحِ طب کا عہد و پیمان کیا تھا ان کو ہی طبیہ کالج میں داخلے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

ان حالات میں مجبور ہو کر ۱۹۲۵ء میں خدمتِ خلق اور فلاح و بہبود طب کی خاطر ایک دوسرا ادارہ جامعہ طبیہ قائم کر لیا۔ اس جامعہ طبیہ کو گلی قاسم جان (موجودہ ہمدرد طبی کالج) میں حکیم محمد کبیرالدین حکیم محمود الیاس خان اور حکیم محمد فضل الرحمٰن خان نے قائم کیا تھا اور حسنِ اتفاق دیکھئے کہ یہ تینوں حضرات شیوخِ جامعہ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جامعہ طبیہ نے اپنے اعلیٰ تعلیمی نظام کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ لیکن اسی دوران حیدرآباد کے ناظم طبابت حکیم نواب مقصود جنگ بہادر نے نظامیہ طبیہ کالج کے لئے جامعہ طبیہ کے اساتذہ کو دعوت دی کہ وہ جامعہ طبیہ چھوڑ کر نظامیہ طبیہ کالج میں درس و تدریس دیں۔ اس دعوتِ شاہی نے بیشتر اساتذہ کو بہتر تنخواہ و مشاہرہ کے عوض حیدرآباد کا سفر کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن حکیم الیاس خاں نہ گئے اور انھوں نے بحسن و خوبی ادارہ طبیہ کالج کی دیکھ ریکھ کرنی شروع کر دی۔ شاید قدرت کی یہ مشیت ایزدی تھی کہ اس طور پر جامعہ طبیہ قائم رہے۔ ۱۹۲۹ء میں حکیم کبیرالدین کو نظامیہ طبیہ کالج کا وائس پرنسپل بنا کر تعلیمی نظام حکیم صاحب کو سونپ دیا گیا۔

اس کالج میں حکیم کبیرالدین نے اپنے حسنِ اخلاق سے اور تعلیمی تجربہ کی بنیاد پر چند اصلاحات کیں جیسے معیارِ داخلہ و نصابِ تعلیم میں اس طور پر تبدیلی کی کہ طبِ قدیم کے ساتھ طبِ جدید کے اُن مضامین کی تعلیم بھی دی جانے لگی جن کا حاصل کرنا دورِ حاضرہ اور مستقبل میں اطباءِ یونانی کے لئے ضروری ہوتا۔ حکیم صاحب ایک انتہائی حساس دل اور صاحبِ فن طبیب تھے اس لئے حکیم صاحب کی بعض ایسی تحریکات کی جو بعد کے غیر فنی ناظم طبابت کی جانب سے کی گئی تھیں مخالفت کر کے حکیم کبیرالدین کے خلاف محاذ تیار کیا گیا۔ حکیم صاحب نے استعفیٰ دیا جو نواب صاحب نے منظور نہ کیا حکمِ سلطانی کے طور پر یہ استعفا بعد میں حکیم صاحب نے واپس لے لیا

لیکن جڑیں مخالفت کی تیز تر ہو گئی تھیں۔ سازش کا نتیجہ سے اوپر تک جال بچھا دیا گیا کہ اب کالج کو حکیم صاحب کی خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ آخر حکیم صاحب کو کالج کو خیرباد کہہ کر تصنیف و تالیف کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اور وہ اپنی قدیمی شائع شدہ کتب کی ازسرنو ترتیب و تدوین میں لگ گئے چنانچہ مباحث اخلاط پر ایک عالمانہ کتب شائع کرنے کے علاوہ شرحِ اسباب کے ضمیمے پر نظرِ ثانی کی اور بہت سے فوائد کے اضافہ کے ساتھ قدیم و جدید علاج میں موازنہ ثابت کیا۔

نظامِ حیدرآباد نے آپ کو شہنشاہِ تصنیفات کے خطاب سے نوازا اور کلیاتِ ادویہ کی تصنیف پر توصیفی نوٹ تحریر کیا۔

تحریر و تصنیف کے علمی دور اور پیشے کے سلسلے میں (۹) نو تمغے حاصل کئے تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کے پرنسپل حکیم عبداللطیف فلسفی کے اصرار اور وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر موصوف کا تقرر طبیہ کالج میں بحیثیتِ ریڈر کے ہوا۔ اور امورِ طبیہ کی تعلیم حکیم کبیرالدین کے ذمہ سپرد کی گئی۔ یہ تو ان کا اصل موضوع تھا دل کھول کر پڑھایا اور خوب دادِ تحسین حاصل کی۔ طلباء اور اساتذہ دونوں مستفید ہوئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد حیدرآباد کی طرح یہاں کی فضا بھی راس نہیں آئی۔ بوجہ مجبوری ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ سے رخصت ہو کر دہلی آ گئے اور ۱۹۶۵ء تک مشیر محکمۂ ترجمہ ہمدرد دواخانہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ طبیہ دہلی کی انتظامی کمیٹی کے رکن بنائے گئے اور آخر تک دونوں کے ممبر رہے۔

مرض الموت و وفات :۔

آخر دنوں میں عرق النساء کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کچھ دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر نہ صرف طب کے بلکہ ہندوستان کے پایۂ تخت میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی بنا پر ۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو سات بجے بعد نمازِ مغرب بیاسی (۸۲) سال کی عمر میں مالکِ معبود سے جا ملے اور طب کا یہ منور ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ ان کی آخری آرام گاہ قبرستان چھیلیان نزد دلی عید گاہ ہے۔

پسماندگان :-

آپ کی اہلیہ آمنہ خاتون جن کا حکیم صاحب کی حیات میں انتقال ہوگیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ۴ صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ڈاکٹر صلاح الدین پی۔ ایچ ڈی۔ کیمسٹری۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر تھے پھر سندھ یونیورسٹی میں تبادلہ کرالیا۔ پھر ریٹائرڈ ہوگئے۔

۲۔ ڈاکٹر علاء الدین صاحب۔ پی۔ ایچ ڈی۔ فارمیسی۔ پہلے انھوں نے بی فارما پھر ایم فارما کے لئے انگلینڈ گئے پھر امریکہ چلے گئے اب وہاں ملازم ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر محمد جمال الدین۔ ایم۔ ڈی۔ یہ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔

۴۔ جلال الدین۔ ایم۔ ایس سی۔ انھوں نے علی گڑھ سے ENTOMOLOGY میں پاس کی تھی۔

صدیقہ خاتون سب میں بڑی تھیں بھائیوں سے بھی۔ ماہ شعبان میں حکیم کبیرالدین صاحب کے انتقال سے کچھ پہلے انتقال ہوا۔

تصنیفات :- حکیم کبیرالدین صاحب نے اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ طب یونانی اور اردو زبان و ترجمہ کے فن کو ایک نئی زندگی، ایک نیا قالب اور سب سے بڑھ کر نئی اساس دی ہے۔ یہ فن اردو زبان ان کے احسان کی رہین منت ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ ایک نئی سمت دے کر اس فن کو اس قابل بنادیا ہے کہ آج وہ دوسرے فنون کے مقابل علوم کے برابر کھڑی ہے۔

آپ نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور قریب بیاسی ہی کتب تحریر کیں

معالجات :-

اکسیر اعظم۔ جلد اول دوم

ترجمہ کبیر۔ شرح اسباب و علامات جلد اول دوم

تشریحی تصاویر۔

تشریح:۔

تشریح کبیر حصہ اول دوم
تشریح صغیر " " "

منافع الاعضا:۔

منافع کبیر۔

کلیات:۔

مخازن التعلیم۔ علاج الامراض۔ القرابادین۔ بیاضِ کبیر دہلی کا مطب۔ حصہ اول دوم۔ دہلی کے مرکبات۔ سوم۔ دہلی کی دوا سازی۔ قانونچہ۔
کلیاتِ قانون۔ اوّل۔ دوم
کلیاتِ نفیسی۔ اوّل۔ دوم

ادویہ دوا سازی:۔

صمدیہ۔ کلیاتِ ادویہ۔ علم الادویہ۔ کتاب الادویہ۔ کتاب انکلیس۔ مجموعہ کبیر۔

علم الجراحت:۔

کتاب الجراحت حصہ اول دوم

علم الامراض:۔

کتاب التشخیص حصہ اول دوم

رسالہ جات:۔

رسالہ حمیات۔ رسالہ حاشیہ و غاشیہ۔ رسالہ امراض صبیان۔ رسالہ جدری۔

رجسٹر :

رسالہ مسامع الصدور۔

رسالہ مقیاس الحرارت۔

رسالہ قبض و بواسیر۔ (حاصور و باسور)

〃 آتشک۔

〃 سوزاک۔

اوزان الادویہ۔ رسالہ اوزان طبی۔

〃 بحران۔

〃 اخلاط۔

〃 وبال و نکال یعنی آتشک و سوزاک

〃 سم الفار۔ رسالہ کچلہ۔ رسالہ مدار بوٹی۔ رسالہ ازاراقی۔

〃 قارورہ 〃 نبض

لغات الادویہ :۔

لغات کبیر۔ طبی فرہنگ۔ القابلہ۔ معالجات امراض نسواں۔ الاکسیر
تجربات قسطنطین۔ آسان نسخے۔ عمل احتقان۔

رسالہ جراثیم اور طبیعت۔

〃 دوران خون۔

〃 طاعون۔ رسالہ ہیضہ۔

〃 سل و دق۔

〃 دیدان امعاء

حمیدی مجربات۔ اصول حمیات۔

تشریح تصاویر کلاں۔ تصاویر احشاء۔ تشریح اعضائے نسوانی۔ کلیات کے
مباحث ضروری۔

ارمغان وغیرہ وغیرہ۔

غرضکہ حکیم کبیر الدین مرحوم کا یہ کارنامہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے فن طب کی نصاب کی اُن کتب کی فراہمی کی جو آج تک کوئی دوسرا ان کے حصہ کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جتنے سال ان کی عمر تھی اتنی ہی انھوں نے کتب تحریر کی تھیں۔ ان کی تصانیف کو اگر اوپر نیچے رکھا جائے تو اتنی لمبی لائن لگے گی جتنا ان کا قد تھا اور اگر ان کی تصنیف کردہ کتب کا وزن کیا جائے تو ان کے وزن کے برابر ان کی تصانیف کی ایک ایک جلدیں ہیں۔

حکیم محمد اسحاق

۱۸۹۵ء ۱۹۷۵ء

مجاہدِ تحریکِ آزادی اور کانگریسی رہنما

اعظم گڑھ جس کی بنیاد بکرما جیت نامی سورج بنسی خاندان کے نومسلم بیٹے اعظم خان ۱۶۶۵ء میں رکھی تھی کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ پہلی تو یہ کہ قومی یکجہتی یا ہندو مسلم اتحاد کا عملی نمونہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسری تحریکِ آزادی میں سب سے پہلی پنچایت عدالت یہیں قائم ہوئی۔ تیسری شبلی کالج جو ایک اقلیتی تعلیمی ادارہ ہے اور یوپی کا علی گڑھ کے بعد سب سے بڑا علمی تاریخی گہوارہ ہے۔ چوتھی خصوصیت جو سب سے بڑھ کر ہے دارالمصنفین شبلی اکاڈمی ہے۔ جسے ۱۹۱۴ء میں حضرت علامہ شبلی نعمانی نے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھا تھا اور اپنی زندگی کا ماحصل خیال کیا تھا۔ شبلی اکاڈمی ایک ایسا فانوس تھا جس کی روشنی میں اس ضلع میں علم، ادب، تہذیب و تمدن سیاست اور معیشت جگمگا اٹھی تھی۔

خاندان :۔

ان کا خاندان اعظم گڈھ کے علمی و ادبی خانوادے کا ایک مشہور و معروف گھرانہ تھا جو معاشی میدان میں کمزور سہی لیکن اخلاقی تہذیبی اور معاشرتی طور پر مضبوط اور علمی دولت سے مالا مال تھا۔ حکیم محمد اسحاق کے دادا حافظ محمد منیر جو کچہری میں ایک جانب محرر تھے تو دوسری جانب اپنے پیشے کی بنا پر سرخاص و عام میں بے پناہ مقبول اور

سے شہر کے وکلاء، مختاروں، حکاموں سے نہ صرف روابط بلکہ قریبی شناسائی بھی تھی۔
ان کے والد شہر کے اچھے حفاظ میں شمار ہوتے تھے اور اعظم گڑھ شہر کی شاید ہی کوئی ایسی مسجد ہو جس میں انھوں نے قرآن کا ختم نہ کیا ہو۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ عید کا چاند نہیں ہوا اور ان کے والد چند مخصوص نمازی احباب کو لے کر ایسی مسجد کا رخ کرتے جہاں رمضان شریف میں قرآن نہ ختم ہوا ہو۔ رات بھر میں قرآن ختم کرتے روپیہ آٹھ آنے کی مٹھائی تقسیم ہوتی اور سحر سے قبل سب لوگ گھر واپس آجاتے غرضکہ ان کا خاندان اپنے وقتوں کا گہوارہ ادب اور علم کی دولت سے مالا مال تھا۔
ان کے دادا کے انتقال کے بعد ان کے ایک معتقد منشی معین الدین نے جو اشعار کہے تھے وہ ذیل میں درج ہیں۔

حافظ نامور منیر احمد ۔۔۔ کامل عصر و نیک نام طبیب
کرتے تھے جب تلاوت قرآن ۔۔۔ لطف ملتا تھا اک عجیب و غریب
دور سے لوگ سننے آتے تھے ۔۔۔ خوش نوا ایسے تھے امام و خطیب
تھے وہ مسکیں نواز بھی ایسے ۔۔۔ ساتھ کھاتے تھے روز چند غریب
حیف اکیس ماہ مارچ کو ۔۔۔ یعنی منگل کی نصف شب کے قریب
سوئے جنت ہوئے روانہ وہ ۔۔۔ باعنایات سمیع و مجیب

بہر سال وفات لکھ دو حنیف
ہائے حافظ منیر پاک طبیب

ان کا انتقال مارچ کی ۲۱ / ۱۹۳۲ء کو ہوا تھا۔

پیدائش :-

اعظم گڑھ کے مشہور محلہ کوٹ میں ۱۸۹۵ء ان کی پیدائش ہوئی اور وقفہ دوران تعلیم کے سوا قریب قریب سارا وقت محمد اسحاق کا اعظم گڑھ میں گذرا۔

تعلیم :-

ابتدائی تعلیم حسب دستور دادا نیز والدین کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور مزید

تعلیم کے لئے مدرسہ اسلامیہ باغ میہ بٹیٹو میں مولوی خدا بخش سے رجوع کی وفارسی کے اچھے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی میں کلام موزوں کہتے تھے، شرح ملا جامی اور منطق کی حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں بعمر ۱۱ سال مشہور استاد القرّی حافظ حسینی سے قرآن پاک کا حفظ کر کے محلہ کی مسجد میں پہلی تراویح پڑھائی۔

طبّی تعلیم :-

۱۹۱۲ء میں ان کے والد نے انھیں طب کی تعلیم کے لئے دہلی مولانا حالی کے ایک عزیز قاری عبدالحلیم انصاری کے ساتھ حکیم اجمل خاں کے ایک شناسا عبدالغفور وکیل کے ایک سفارشی خط کے ہمراہ روانہ کیا۔ چنانچہ ان کا داخلہ مدرسہ طبیہ دہلی میں ہو گیا اور تعلیم طب شروع ہو گئی۔

جہاں داخلہ کے لئے مزید عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔

تاریخی سہو اور عفو :-

دوران تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی میں ایک واقعہ ہو جانے کی بنا پر ان کا نام مدرسہ سے خارج کر دیا گیا۔

جب یہ اعلیٰ درجہ کا امتحان دے چکے تھے اور درجہ سوم والوں کا امتحان ہو رہا تھا کہ ہم جماعتوں کو خیال گزرا کہ نیچے درجات والوں کو امتحان میں مدد دی جائے امتحان کا قاعدہ یہ تھا کہ پہلے پرچے تقسیم ہو جاتا تھا۔ پھر بآواز بلند پڑھا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ جو طلباء مدد پر آمادہ تھے انھوں نے یہ سوالات سن لئے اور پاس کی مسجد میں بیٹھ کر کتابوں کی مدد سے وہ سوالات حل کرنے لگے۔ محمد اسحاق بھی ان سوالات حل کرنے والے طلباء میں شامل تھے۔ شامت اعمال کہ کسی طرح یہ خبر پیرجی حکیم سید عبدالرزاق جو معلم تشریح الاعضا تھے کو مل گئی تھی وہ مسجد میں داخل ہوئے اور تمام موجود ملوث طلباء کے نام لکھ کر حکیم اجمل خان کے سامنے پیش کر دیئے۔ اس واقعہ کی جانچ کے لئے حکیم اجمل خان نے ایک تحقیقاتی کمیشن رسالہ رفیق کے ایڈیٹر اور سابق جج پیرزادہ محمد حسین کی سربراہی میں مقرر کر دیا۔ تحقیقی

رپورٹ کی بنیاد پر دیگر طلباء کے ساتھ ان کو کالج سے اخراج کا حکم سنایا گیا اور مزید امتحان میں شرکت سے محروم کر دیا گیا۔ اس دوران حکیم اجمل خان شملہ چلے گئے۔ طلباء کی جانب سے حکیم صاحب کو متعدد تار دیئے گئے کہ ہاسٹل میں رہنے اور امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ حکیم اجمل خان کی شملہ سے واپسی پر تمام طلباء ان کی خدمت میں حاضر ہوئے حکیم صاحب نے شرفِ باریابی بخشا۔ اس موقعہ پر حکیم اجمل خاں کے پاس مدرسہ طبیہ کے مشیرِ اعلیٰ پیرزادہ محمد حسین بھی تشریف رکھتے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھئے اگر میں ان کو معاف کر دیتا ہوں تو دوسرے طلباء کو شئے ملتی ہے اور اگر سزا دیتا ہوں تو ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب کے سامنے تمام طلباء نے اپنی غلطی کا اعتراف اور توبہ کی تو حکیم صاحب نے ازراہِ شفقت معافی اور ضمنی امتحان میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی۔

دورانِ تعلیم انھوں نے طب کے اُن اساتذہ سے کسب فیض حاصل کیا۔ جو نہ صرف اپنے وقت کے جید طبیب تھے بلکہ ان کو شفاء الملک مسیح الملک حکیم اجمل خانؔ کے خاص شاگردِ رشید ہونے کا بھی موقع ملا۔ ایک بار حکیم اجمل خان نے ان سے کہا کہ "آج تم مرضاء کی تعداد کا شمار کرو۔ گرمیوں کے دن تھے اور ۱۲ بجے تک مریضوں کی تعداد پانچسو کے قریب ہو چکی تھی۔ حکیم اجمل خاں کا مریض کی نبض پر دو ایک ثانیے کے لئے ہاتھ ہوتا اس کے بعد بیٹھے ہوئے طالب علموں کو نسخہ لکھنے کا اشارہ ہوتا اور جو طالب علم سب سے پہلے ان کی خدمت میں نسخہ پیش کر دیتا اس میں بقدرِ ترمیم و اصلاح کر کے نسخہ مریضوں کے حوالے کر دیتے۔ حکیم صاحب کے یہاں نسخہ لکھنے والے شاگردوں کی تعداد بارہ کے قریب تھی اس طور پر ان کو پانچ سو مریض یومیہ کے حساب سے ۲ سال تک حکیم اجمل خاں کی شاگردی اور مریضوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

حکیم اجمل خان کی سربراہی میں طبِ یونانی کو فروغ دینے اور نصاب تیار کرنے کے لئے اصلاحِ طب کے نام سے جو ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی اس میں حکیم کبیر الدین جیسے مایۂ ناز طبی کتب کے مصنف پروفیسر حکیم فضل الرحمٰن صدرالاطباء حکیم محمد

الیاس خاں۔ حکیم سید ناصر عباس اور حکیم عبدالحفیظ جیسے شیوخ جامعہ کے ساتھ یہ بھی شریک تھے۔

اعظم گڑھ جو اس وقت مشاہیر اطبا، کا مرکز اور ان مشاہیر اطبا، کے علاج ومعالجہ کا چہار جانب شہرہ تھا ان اطبا، میں حکیم الٰہی بخش۔ حکیم علی مقیم زنگی پوری۔ حکیم کرامت حسین۔ حکیم سید بدلو۔ حکیم عبدالواحد غازی پوری۔ حکیم محمد نبی جراجپوری حکیم شاہ دیوبند۔ حکیم سرستیہ قابل ذکر ہیں۔ ایسے ہی حالات میں انھوں نے اعظم گڈھ کے محلہ کوٹ میں دواخانہ کھولا۔ شروع شروع میں مرضا، کی تعداد دس پندرہ رہی۔

سیاسی وسماجی خدمات :۔

ابھی حکیم محمد اسحاق کی عملی زندگی یعنی طبابت کی پریکٹس شروع ہی ہوئی تھی کہ ملک میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت کا آغاز ہوگیا اور پورے ملک میں ایکٹ کی مخالفت کل ہند پیمانے پر شروع ہوگئی۔ اسی موقع پر اتحادیوں نے ترکی کے حصّے بخرے بھی شروع کردیئے جس کی بنا پر سارے ہندوستان میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور کل ہند پیمانے پر مندرجہ ذیل مطالبات کی مانگ ہوئی۔

۱۔ سرکاری خطابات چھوڑے جائیں۔
۲۔ سرکاری اسکول چھوڑے جائیں۔
۳۔ شراب چھوڑی جائے اور شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔
۴۔ سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے اور وکیل وکالت چھوڑیں۔
۵۔ ودیشی کپڑوں کا استعمال ترک کیا جائے اور غیر ملکی کپڑوں کی دوکانوں پر ہڑتال کی جائے۔

غرضکہ سارے ملک میں قومی بیداری کی تحریک پیدا ہوگئی تھی اور اس تحریک کے اثرات سے اعظم گڈھ بھی نہ محفوظ رہ سکا۔

اساتذہ سے سرکاری اسکولوں کو چھوڑنے اور عوام سے کھدر کا بنا کپڑا اور سوت کاتنے کو کہا گیا

اسی زمانے میں خلافت تحریک نے اپنا زور دکھانا شروع کردیا ۱۹۱۹ء میں

گاندھی جی تحریک خلافت کے صدر پہلے ہی چنے جا چکے تھے ۴ تا ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ اجلاس نے ملک گیر پیمانے پر بیداری کی لہر پیدا کردی تھی اور ۲۳ ستمبر ۱۹۲۰ء کو جب غیر ملکی کپڑوں کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا تو ہندو اور مسلمان متفقہ طور پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آ گئے اور گاندھی جی کی قیادت میں سب نے مل جل کر کام کرنا شروع کیا اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں یہ تحریک پھیل گئی۔

بدیشی بائیکاٹ :-

۱۹۲۱ء میں جب غیر ملکی کپڑوں کے مکمل بائیکاٹ کا سلسلہ شروع ہوا تو پورے اعظم گڈھ میں یہ تحریک زور پکڑ گئی اور خلافت کمیٹی و کانگریس پارٹی کے ممبروں کے ساتھ حکیم محمد اسحاق بھی شہر و قصبات کا دورہ کرکے غیر ملکی کپڑوں کی گانٹھوں کو مہر بند کرنے اور ایسا نہ کرنے والوں کی دوکان پر ہڑتال کی جاتی جس سے خریداروں کی آمد کم ہوتی گئی چونکہ اعظم گڑھ کا قصبہ مئو کپڑے کا صنعتی مرکز ہونے کا فخر حاصل تھا اس لئے کانگریس اور خلافت کمیٹی کے چوٹی کے لیڈران موتی لال نہرو اور مولانا محمد علی و شوکت علی برادران برابر آتے رہے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو جا رہے مئو آرہے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی۔ موسم سخت تھا اور دوسری کوئی سواری نہ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے اور سیئر امجد علی غزنوی کے والد نے ریلوے سے ٹرالی میں نہرو کو مئو پہنچایا جس کی پاداش میں اور سیئر امجد علی کو ملازمت سے معطل کردیا گیا۔

دینی مدارس خصوصاً اعظم گڈھ کا دینی مرکز درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے طلباء اور اساتذہ خصوصاً مولوی شبلی متکلم مولانا امین احسن اصلاحی، اختر احسن اصلاحی اور مولوی عبدالجلیل اصلاحی نے تحریک آزادی میں بہت تعاون دیا۔ ان کے ساتھ تحریک میں دیگر جن لوگوں نے تعاون دیا ان میں ان کی اہلیہ محترمہ نے نہ صرف تعاون دیا بلکہ حکیم محمد اسحاق کی بڑی بہن نے مئو کی لشہری ساری ہیرا اکنی کے دوپٹے اور دوسرے غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلائی۔ مستورات میں تقاریر

کیں اور دیگر خواتین کو ترغیب دلائی۔

ان کے ان کارناموں پر اچھا اثر مرتب ہوا۔ شہر میں تو اس تحریک نے اس قدر نمایاں کامیابی حاصل کر لی کہ مولوی مسعود علی ندوی اور سید سلیمان کی کوششوں سے ایک سودیشی کپڑوں کی دوکان کھول دی گئی۔ عبدالرؤف ساکن چھاؤں اور شادیالین اس کے نگراں اور فروخت کنندگان مقرر ہوئے اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد اسحاق نے اپنے دیگر ہندو و مسلم ساتھیوں بھوانی پرشاد وکیل حاجی عبدالغفور حسنہ، عبدالشکور دفتری بدرالدین خاں ظہیر خان مولوی اسلم انصاری، یاسین مرحوم و حافظ احمد اور پرشوتم کہار وغیرہ کے ساتھ تحریک کے دوسرے رخ جس کا مقصد شراب اور سگریٹ کی دوکانوں نیز آب کاری کے دفاتر پر پکیٹنگ کی جس کی وجہ سے بہت سے ساتھی انگریزی مظالم کے شکار بھی ہوئے۔ جن میں پرشوتم بہت ان مظالم کا شکار رہا۔

تحریک کے تیسرے رخ کے طور پر ضلع کے مختلف قصبات میں عدالتی پنچایتیں قائم کی گئیں والنٹیر بھرتی کئے گئے اس تحریک کے تیسرے جز کا سب سے اچھا نتیجہ مئو میں دیکھنے کو ملا۔ جہاں والنٹیرس کی باقاعدہ تربیت اور بھرتی ہوئی تھی۔

تحریک کے دوسرے رخ اساتذہ سے اسکول چھوڑنے کی اپیل پر جہاں اساتذہ اسکولوں میں پڑھانا چھوڑ دیا لہٰذا تحریک کی کامیابی اور ایک سچے مجاہد کی طرح انھوں نے بھی اپنی مادر علمی مدرسہ اسلامیہ باغ میر پیٹو میں پڑھانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی۔ دس بجے تک مطب میں رہتے، پھر اسکول پڑھانے چلے جاتے وہاں سے گاندھی جی کے قائم کردہ اسکول جودھی پور میں چلے جاتے اور وہاں چرخہ چلاتے اور سوت کاتتے۔ اس طرح انھوں نے دو تین سال دن گنے اور خود اپنے ہاتھ سے کاتے سوت کا ایک پاجامہ بنوایا۔

تحریک کی دوسری کڑی خود اپنے اسکولوں کو کھولنا اور اُن اساتذہ سے جو سرکاری اسکولوں کو چھوڑ چکے تھے یا جو طلباء اسکولوں میں تحریک کے زیر اثر تعلیم کو خیر باد کہہ چلے تھے یا جن کا نام اسکول سے خارج ہو چکا تھا اس مقصد کے تحت محلہ پہاڑ پور میں گاندھی جی کے نام پر ایک اسکول مولانا شبلی کے والد حبیب اللہ

کے مکان میں کھولا گیا۔ شاہ علاؤ الحق وکیل اس مدرسہ کے اہم سرگرم کارکن اور مدرس تھے۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی اور اردو تھا۔ طالب علموں میں مہاراج گنج کے شفیق صاحب رفیق صاحب اور رام آسرے قابلِ ذکر تھے۔

یہ رام آسرے وہی ہیں جنھوں نے اسی زمانے میں قصبہ سرائے میر میں مسلمانوں کے ایک عام جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے دعائے قنوت پڑھی کہ آپ ونشکر لک ولا نکفرك و نخلع و نترك من یفجرك پڑھتے ہیں پھر آج آپ باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں۔؟

انگورہ فنڈ:۔

حکیم محمد اسحاق کی قومی خدمات میں ایک بڑی خدمت ترکی کی نئی حکومت کے لئے فنڈ کی فراہمی تھی۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے ہمعصر اور تحریک آزادی کے متوالے مولوی مسعود علی کے ساتھ ساتھ روزانہ پچاس پچاس میل کا سفر کیا تھا۔ اس اسکیم کے تحت انھوں نے ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ کا فنڈ اکٹھا کیا تھا جس میں شہر کے علاوہ مئو۔ مبارک پور۔ سرائے پور بھریا اور منڈیار کے لوگوں نے بڑی فراخدلی سے نہ صرف چندہ بلکہ زیورات تک دے دیئے تھے پھریہاں کی ایک خاتون ہمشیرہ جسٹس اقبال یعنی والد علی نے اپنا طلائی نکلس دے دیا تھا جس کی قیمت اس دور میں پانچسو روپیہ تھی۔

تحریک آزادی سے دلچسپی اور شرکت کی بنا پر ان کے خاندان کے زیادہ تر افراد بھی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ حکیم اسحاق کے والد [illegible] انجمن کے صدر بنائے گئے جو بازو پر سیاہ بلے لگائے اختیار [illegible] رہتے تھے۔ اعظم گڈھ میں تحریک آزادی کے زیادہ تر جلسے کربلا کے میدان میں رہتے تھے۔ یاسین اور جہید و رات رات بھر جھنڈیاں بناتے رہتے تھے حکیم اسحاق کی بیوی اور بڑی بہن بھی شریک جلسہ ہوتیں۔ چنانچہ جب ایک بار بلبل ہند سروجنی نائیڈو جلسہ میں شرکت کے لئے آئیں تو دیگر خواتین کے ساتھ ان کی بیوی اور ہمشیرہ سے بھی سروجنی نائیڈو کا تعارف کرایا گیا۔ جہاں کافی دیر تک

تحریک میں خواتین کی دلچسپی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ان کی بڑی بہن نے تحریک میں فنڈ کے لئے ذاتی زیورات بھی دے دیئے تھے۔ یہاں تک کہ جب ناک کی کیل اور کان کے جھمکے فنڈ میں دیئے تو مولوی مسعود علی نے یہ سب زیورات واپس کر دیئے اور کہا کہ حکیم صاحب کی ہمشیرہ سے اس سے زیادہ ملنا چاہیئے چنانچہ ان کی بڑی بہن نے ان زیورات کے ساتھ ناک کی نتھ کا اضافہ کر کے تحریک آزادی کے فنڈ میں یہ زیورات دے دیئے۔ ساتھ میں حکیم صاحب کی اہلیہ محترمہ نے بھی اپنے کان، ہاتھ اور ناک کے زیورات چندہ میں دیئے۔

چندے کی رقم کا حساب کتاب لاکھوں میں تھا۔ اس وقت کے جلسوں میں عوام کی بے پناہ شرکت ہوتی تھی اور بچہ بچہ کی زبان پر یہ شعر زبان زد تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

اعظم گڑھ میں جب خلافت کمیٹی اور عدم تعاون تحریک سے مل کر ذیلی خلافت کمیٹی بنی تو اس کمیٹی میں ستاون ممبر تھے جس میں حکیم اسحاق کا نمبر تیسرا تھا۔

تحریک میں جب گاندھی جی کی شمولیت ہوگئی تو اس موقعہ پر متعدد نظمیں لکھی جس کا یہ ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا۔

حکیم اجمل خاں مسیح الملک یہی کہتے تھے
ہم ہیں گاندھی کے طرفدار ہمارا گاندھی

۱۹۲۱ء میں یہ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے اور پارٹی کی حیثیت اس وقت بہت مستحکم ہو چکی تھی اور نمایاں حیثیت اختیار کر چکی تھی دسمبر ۱۹۲۲ء کو کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ یہ ان کی اپنے شہر اعظم گڑھ سے کسی دوسرے شہر کے اجلاس میں پہلی بار شرکت ہوئی تھی۔ گیا میں جب کانگریس دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ تبدیلی کے موافقین اور مخالفین کے نام سے جس کی وجہ سے آپس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ حکیم اسحاق تبدیلی کے موافقین کے ہمنوا تھے اور کونسلوں میں جا کر شرکت کرنے کے بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ اسی زمانے میں گیا میں خلافت کمیٹی کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا جس میں

ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان برابر شریک جلسہ رہتے تھے۔
ان کے ساتھ ان کے شہر اعظم گڑھ میں شاندار پولٹیکل کانفرنس بھی ہوتی تھیں جس میں رات رات بھر جاگ کر پنڈال کی تعمیر ہوتی اور سارا فرش و دیگر سامان کھدر کا رکھا جاتا تھا۔ ہندو و مسلم مل کر چندہ دیتے تھے۔ جلسہ گاہ میں نظم و نسق کا معیار اتنا بلند ہوتا تھا کہ لیڈروں کا پنڈال۔ سامعین کے بیٹھنے کی جگہ اور اخبار نویسوں کی گیلریوں کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا۔ موتی لال نہرو۔ مولانا محمد علی۔ سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری برابر مشترکہ طور پر ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔
پنڈت جواہر لال کے والد موتی لال نہرو ان جلسوں میں زیادہ شریک ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ مشرقی کلچر کے دلدادہ اسلامی تہذیب اور زبان کے شیدائی اور مسلمانوں کے دستر خوان اور کھانوں کے عاشق تھے۔ مشرقی اضلاع کے دورے میں اعظم گڑھ کو اہمیت دیتے تھے اور کھانا دارالمصنفین میں کھاتے تھے اور مرغ دماہی و پلاؤ کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ محمود آباد کے گھر ڈنر تھا جس میں انگریزی اسلامی اور ہندوستانی کھانے یکے بعد دیگرے کھلائے گئے۔ موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو تو آخر وقت تک تینوں اقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے جبکہ دیگر شرکاء ڈنر پہلے ہی دور کے کھانے سے عدم واقفیت کی بنا پر پیٹ بھر چکے تھے۔ موتی لال نہرو کی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی دارالمصنفین میں قیام رہتا تھا جہاں جواہر لال نہرو مہمان خانہ کے سامنے بنے ہوئے [illegible] اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔
حکیم محمد اسحاق اپنی دواخانہ کی مصروفیات کے باوجود برابر شریک جلسہ و میٹنگ رہتے تھے۔ اگرچہ اعظم گڑھ کے باہر قصبات میں بھی اکثر شرکت رہتی لیکن شام یا رات کو کسی پہر واپس آجاتے تاکہ صبح کے مطب کا ناغہ نہ ہو۔ کم و بیش برابر شہر سے باہر کے مریضوں کو دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا۔
لاہور میں کانگریس کا آل انڈیا اجلاس ہونے کے بعد وہاں کے

ریزولیشن اور ہدایت کے بموجب جنوری ۱۹۳۰ء میں اعظم گڈھ کانگریس کمیٹی کی از سر نو تنظیم ہوئی تو حکیم اسحاق اس کمیٹی میں نائب صدر مقرر کئے گئے تھے۔

ملک میں آزادی کی تحریک کے سلسلے میں کانگریس پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا ۲۸۔ ۱۹۲۷ء میں کان پور میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد کو کرنی تھی۔ یہ اپنے رفقاء کے ساتھ شاہ گنج تک پہنچے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی یہ لوگ شرکت کرنے سے مایوس ہو گئے۔ جلسہ کے صدر مولانا آزاد کو تار دیا گیا کہ خطبۂ صدارت تاخیر سے شروع کیا جائے چنانچہ جب یہ اپنے رفقاء کے ساتھ جلسہ میں پہنچ گئے تو خطبۂ صدارت کا آغاز ہوا۔ اسی طرح انھوں نے کلکتہ کے اجلاس میں بھی شرکت کی جس میں اکابرین ملک بھی شریک تھے۔

۲۶ فروری ۱۹۳۰ء کو سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہوا اور ۱۲ مارچ کو گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کی شروعات کر کے نمک بنانے کا قانون توڑا۔ ۱۴ تا ۱۶ فروری ۱۹۳۰ء کو واردھا میں منعقدہ اجلاس میں مندوبین کانگریس کی جانب سے عام ستیہ گرہ کا اجازت نامہ لے کر آئے تھے ان کے ساتھ ان کے دیگر رفقاء مولوی مسعود اور حاجی عبدالغفور خستہ وغیرہ نے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ گنی سنگھ باغ میں نمک بنا کر قانون توڑا۔ اس وقت قانون کے مطابق نمک بنانے کی سزا گرفتاری سزا اور جائداد کے نیلام کا حکم تھا اس تحریک میں خاندان کے دیگر افراد میں ان کے پھوپھی زاد بھائی ثناء اللہ۔ نورالہدیٰ۔ محمد وکیع اعظمی بھی پیش پیش رہے۔
نمک سازی کے سلسلہ میں یہ اور تحریک آزادی کے سپاہی وساتھی سورج ناتھ سنگھ نظام آباد جا کر عوام کو تحریک کے سلسلہ میں آمادہ کر رہے تھے کہ حکیم محمد اسحاق کو اطلاع ملی کہ شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ پھر الہ آباد میں تحریک کے سلسلے میں صوبائی میٹنگ تھی حکیم محمد اسحاق کو بھی شرکت کرنی تھی لیکن عین وقت ایک مریض کو دیکھنے کے لئے شہر سے باہر جانا ہوا جس کی بنا پر یہ الہ آباد نہ جا سکے۔ دیگر شرکاء جو تقریب تعداد میں ۲۵ تھے جب لوٹ کر آئے تو شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لئے گئے۔

اس طرح ان کو صوبائی کانفرنسوں میں صوبائی ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے برابر شریک

ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار گورکھپور میں صوبائی میٹنگ تھی کھانا فراق گورکھپوری کے مکان پر جس میں مٹی کے پیالوں میں گوشت کھلایا گیا اور چائے پلانے میں کیتلی کی جگہ مٹی کے بنے ہوئے لوٹوں شکر ڈالنے کے لئے آم کے پتوں اور چائے میں شکر چلانے کے لئے آم کی چھوٹی چھوٹی شاخوں سے چمچہ کا کام لیا گیا۔ حکیم اسحاق چونکہ کانگریس پارٹی کے عہدے دار ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی سے بھی وابستہ تھے اس لئے ان کی شرکت لازمی رہی تھی۔

۱۹۳۲ء میں ان کے والدِ ماجد کا انتقال ہو گیا جس کے سبب مزید ذمہ داریوں اور تنہائی کا احساس ہونے لگا لیکن اس کے باوجود بھی قومی ملّی و سیاسی دلچسپیوں میں کوئی کمی نہ آسکی۔ مطب کی پریکٹس بھی خاصی چل چکی تھی۔ اور شاید ہی کوئی ایسا موقع ہوگا جو انھوں نے مطب چھوڑا ہو ساری ادبی تہذیبی اور سیاسی مشاغل کا مرکز یہی مطب تھا۔ مرضا میں ہندو مسلمان دونوں کی تعداد ہوتی۔ اکثر شہر باہر مریضوں کو دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا۔ حسبِ دستور اور وعدہ استاذِ طب محترم حکیم اجمل خاں صاحب کے نہ تو کسی سے فیس کا تقاضا کرتے اور نہ ہی لیتے اگر کوئی مریض خوشی خوشی دے دیتا تو عطار کے پاس جمع کرنے کی ہدایت فرما دیتے۔

اعظم گڈھ شہر میں یوں تو تعلیم کی ابتدا مولانا شبلی کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی۔ شبلی منزل اور شبلی اسکول کی بدولت ضلع میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر ایسی کوئی انجمن نہ تھی جو لوگوں کے اندر ادبی ثقافتی اور تہذیبی ذوق پیدا کر سکتی ہے چنانچہ اعظم گڈھ کی ایک مشہور شخصیت اسماعیل ... نے ۱۹۰۷ء میں انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں مشاہیر علماء کی شرکت ہوتی تھی۔ ان جلسوں میں شرکت کی بنا پر اقبال سہیل سے ملاقات ہوگئی اور حکیم صاحب نے پھریہا جانا شروع کر دیا۔ پھریہا کے سفر میں حکیم محمد اسحاق کئی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم سفر رہے۔ پھریہا جانے کا مقصد مولانا حمید الدین فراہی سے نیاز حاصل کرنا ہوتا تھا جو نہ صرف ایک بزرگ تھے۔ بلکہ مدرستہ الاصلاح کے بانی بھی تھے۔ حکیم محمد اسحاق عام طور پر گیارہ بجے تک مطب کرتے پھر پھریہا چلے جاتے وہاں سے رات گئے تک لوٹ آتے تھے۔ مولانا

حمیدالدین فراہی کی وجہ سے سرائے میر میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ جہاں مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی سے بھی گہرے مراسم ہو گئے۔ یہ دونوں عالم تھے اور مولانا حمیدالدین فراہی کے خصوصی شاگرد بھی۔ جو آگے چل کر ان کی تحریک میں بہت معاون بنے۔ اسی درمیان ایک بار جب علامہ شبلی کے پاؤں کو حادثہ پیش آ گیا تھا تو اپنے والد کے ہمراہ علامہ شبلی کو دیکھنے گئے اس وقت دارالمصنفین کا کتب خانہ کچے بنگلہ میں تھا۔ اسی کے برآمدے میں مولانا قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ارد گرد کتابوں کا انبار تھا اور ۱۹۱۹ء میں جب تعلیم طب سے فراغت کر کے آئے تو اپنے دوست رشید احمد کے ساتھ مولانا شبلی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے تو وہیں مولانا مسعود علی۔ سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں سے ملاقات ہو گئی پھر مراسم بڑھتے دارالمصنفین زندگی کا ایک جزو بن گیا اور تقریباً ہر روز شام کو وہاں پر نشست میں جانے لگے۔ دیگر رفقاء ادارہ سے شناسائی ہو جانے پر علاج و معالجہ کے تعلق سے دارالمصنفین کے ایک فرد بن گئے۔

تحریک خلافت کے دنوں میں ان کے روابط دارالمصنفین میں آنے جانے والے عمائدین سے بہت بڑھ گئے تھے۔ کیونکہ مریضاء آتے تھے اور حکیم محمد اسحاق کو ان سے دارالمصنفین میں ملنے کا موقع ملتا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو جب مولانا محمد علی جوہر آئے تو شاہ گنج سے دارالمصنفین تک ہزارہا آدمی ان کے استقبال اور ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔ اسی سال جون میں پنڈت مدن موہن مالویہ بھی شبلی منزل میں تشریف لائے اور لائبریری نیز دوسرے شعبے دیکھے اور زبان کے مسئلے پر گفتگو کی۔ فروری ۱۹۲۰ء میں سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر ضیاء الدین تشریف لائے۔ سپرو نے فرمائش کر کے صہبائی کا دیوان دیکھا۔ سپرو کے دادا صہبائی کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے علم ہیئت کی کتب کا معائنہ کیا۔ اسی طرح حبیب الرحمن خاں شیروانی اور صدر یار جنگ بھی تشریف لائے ان کو شبلی اسکول میں ایڈریس دیا گیا۔ اور آخر الذکر نے جوابی تقریر کی۔ ان کے ساتھ آنے والوں میں نواب مزمل اللہ خاں بھی تھے جنھوں نے دارالمصنفین کی کچی مسجد کو پختہ بنوانے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی۔

صدر یار جنگ نے سنگِ بنیاد رکھا اور مولانا حمیدالدین فراہی نے گارا اپنے سر پر رکھ کر ڈھویا۔

حکیم محمد اسحاق کی روزانہ شام کو دارالمصنفین میں حاضری ضرور ہوتی تھی۔ برسہا برس تک ان کے والد نے شبلی منزل کی مسجد میں تراویح پڑھائی تھی۔ اب حکیم اسحاق کی ذمہ داری تراویح پڑھانے کی رہی۔ تراویح پڑھانے کا قاعدہ یہ ہوتا تھا کہ حکیم محمد اسحاق اپنے گھر میں ۱۲ رکعت پڑھا کر کسی سال پیدل، کبھی یکّہ پر اور کبھی محمد علی مختار کی موٹر پر بقیہ نماز پڑھانے چل دیتے تھے۔ اور چودھویں رمضان کو قرآن ختم کر دیتے۔ شبلی منزل یا دارالمصنفین میں حاضری کا یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک چلتا رہا کہ عصر و مغرب کے درمیان حاضری ضرور رہتی تھی۔ حکیم اسحاق نے شبلی منزل اور موجودہ دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ اپنے مادر علمی مدرسہ باغ پنٹو کی عرصہ تک نظامت بھی کی تھی۔

تحریک کے دوران ان کی ملاقات مشہور انقلابی شاعر انور صابری اور سلام مچھلی شہری سے بھی ہوئی۔ انور صابری سال میں کئی بار مئو مبارک پور اور سرائے میر کے جلسوں میں آئے تو حکیم محمد اسحاق کے گھر بھی آئے۔ اوقات مطب میں جب یہ شاعر ان کے دواخانے میں آکر بیٹھتے تو انور صابری کو دیکھنے سننے اور ملنے کے لئے لوگ آتے رہتے۔ حکیم محمد اسحاق مریضوں کو دیکھتے رہتے اور نسخے لکھتے رہتے اور احباب کی مجلسی گفتگو کے ساتھ ساتھ انور کی نظموں اور انقلابی اشعار سے بھی محظوظ ہوتے رہتے تھے۔

انور صابری کے حسبِ ذیل اشعار بہت پسند کئے جاتے تھے۔

اکڑتے پھرتے ہیں ہر سو جو مغربی بندر	ہم ان کو ایک طمانچے میں رام کرلیں گے
تم اپنا بوریا بستہ سنبھال کر بھاگو	ہم اپنے ملک کا خود انتظام کرلیں گے

جس طرح جوش ملیح آبادی کے اشعار نے ایک وقت میں جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اسی طرح انور صابری کے اشعار بھی زبان زد تھے۔

سلام اے تاجدار جرمنی اے ہٹلر اعظم	فدائے قوم شیدائے وطن اے نیّر اعظم
سُنا ہی ہوگا تو نے ایک بدبختوں کی بستی ہے	جہاں انسانیت بھی آج جینے کو ترستی ہے

انور صابری نے بھی ایک نظم اسی نظم کے مقابلہ میں ایک جلسہ گاہ میں جب پڑھی۔

نظام آباد میں میری تمنا پوچھنے والے　　دلِ محکوم کا رنگیں فسانہ پوچھنے والے
تمنا ہے کہ یوں بدلہ کبھی جھانسی کی رانی کا　　تمنا ہے کہ یوں بدلہ بھگت سنگھ کی جوانی کا
تمنا ہے کہ یوں بدلہ پشاور کے شہیدوں کا　　بہادر شاہ کے معصوم بچوں کی امیدوں کا

ان اشعار کے نتیجہ میں مولانا سعید احمد۔ انور صابری اور رفیع اختر کے نام وارنٹ جاری ہو گیا۔ اور مولانا سعید احمد عین عید سے دو یوم قبل گرفتار ہو کر اعظم گڑھ لائے گئے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کا جب نعرہ لگا اور جمعیتہ علماء نے ہندوستان کے پچاس علماء کے فتاوی سے ایک اشتہار چھپوا کر شہر میں چسپاں کرانے کے لئے پہلے مبارکپور پھر اعظم گڈھ میں یہ اشتہار لاکر حکیم صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ شہر میں چسپاں کرا دیں۔

حکیم محمد اسحاق نے مولوی عبدالحق کو بلوا کر اشتہارات اور لیئی کے لئے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ یہ اشتہارات آج ہی رات چسپاں کرا دیں اور کانگریس کے ایک اہم جلسہ میں شرکت کرنے اور تقریر کرنے نظام آباد چلے گئے۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ مشتاق نے حکیم محمد اسحاق کو آکر خبر دی کہ ان کی گرفتاری یقینی ہے۔ یہ چند جوڑے کپڑے قرآن شریف۔ مطالعہ کے لئے کچھ کتب اور بستر کے ساتھ جیل جانے کو تیار ہو گئے۔ مگر گرفتاری صرف عبدالحق کی ہوئی۔ یہ محمد اسحاق کی تیسری گرفتاری کی خبر تھی۔ پہلی سورج ناتھ سنگھ کے ہمراہ نظام آباد جاکر نمک بنانے کی تحریک کے لئے عوام کو آمادہ کرنے پر۔ دوسری الہ آباد میں صوبائی میٹنگ کے موقع پر۔ جب یہ الہ آباد نہیں گئے تھے بلکہ ایک مریض دیکھنے چلے گئے تھے ہاں ان کے دیگر ساتھی جن کی تعداد ۵۲ کے قریب تھی گرفتار کر لئے گئے تھے یہ گرفتار نہ ہو سکے تھے۔ تیسری یہ پوسٹر کے سلسلے میں تھی جو نہ ہو سکی۔

گاندھی کیمپ :-

تحریک میں دن بدن تیزی آرہی تھی۔ انگریزوں سے ہندوستان چھوڑو کی مانگ سے

ہندوستان کا ہر شہر لرز رہا تھا ۱۹۴۲ء کے انہی ہنگاموں سے پولیس نے عوام کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ اور خاص بات یہ تھی کہ جو شخص گاندھی ٹوپی پہن کر نکلتا۔ پولس والے اس کے سر پر سے زبردستی ٹوپی اتار لیتے یا اُتروا دیتے۔ حکیم استحاق کے چند ساتھیوں نے پولیس والوں کی زبردستی کے باوجود گاندھی ٹوپی نہیں اتاری تھی۔ انہی دنوں ایک اہم واقعہ ہوا۔

حکیم محمد استحاق جن کا ان دنوں اعظم گڈھ میں شہرہ تھا۔ اعظم گڈھ کے ایک جج کی دختر بیمار ہوگئی۔ اس کو جاکر دیکھنے کے لئے جج صاحب نے گاڑی بھجوائی۔ حکیم صاحب نے صرف اس نظریئے سے کہ وہاں پر کہیں گاندھی ٹوپی کی بے حرمتی نہ ہو جائے (کیونکہ حکیم صاحب گاندھی ٹوپی پہنتے تھے) اس خدشہ کا اظہار کیا۔ لیکن جج کی یقین دہانی پر حکیم استحاق گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے اس جج کی لڑکی کو دیکھنے گئے۔

اس دور کی تحریک میں ان کے ساتھ جو ساتھی رہے۔ ان میں یحییٰ اعظمی ۔ بھوانی پرشاد مختار ڈاکٹر حفیظ اللہ۔ سیتارام استھانا۔ سورج ناتھ سنگھ۔ ناگیشور پرشاد وکیل جن کے لڑکے کی شادی ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی پوتی سے ہوئی تھی۔ مولوی عبدالباری۔ حاجی علی حسن اور شمس الدین خاص تھے۔ لیکن ان سب میں جرائت مندانہ ہستی مولوی عبدالحق کی تھی۔ لالہ کنورسین جو دہلی طبیہ کالج میں حکیم استحاق کے ہم جماعت تھے وہ بھی ۱۹۴۲ء میں تحریک کے سلسلے میں میرٹھ میں گرفتار ہوکر فیض آباد جیل بھیجے گئے تھے۔

۱۹۴۲ء کے اس ہنگامے کے بعد جب آزاد ہند فوج پر مقدمہ چلانے کی بات چلی تو پورے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ پھر جب ملکی حالات بدلے اور برطانیہ نے صلح و صفائی پر آمادگی ظاہر کی جب کہ چرچل کسی بھی صورت میں ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں نہ تھا۔ برطانیہ میں ہونے والے الیکشن میں لیبر پارٹی کو اکثریت ملنے پر لیبر پارٹی اور اٹلی کی وزارت عظمیٰ نے ہندوستان کی آزادی کے راستے ہموار کردیئے۔ چنانچہ لارڈ ڈیول کی آمد کیبنٹ مشن کی گفتگو نے لوگوں کی امیدیں بڑھا دی تھیں لیکن ملکی سیاست پر مسلم لیگ کا اثر بڑھنے لگا تھا۔

۱۹۴۵ء میں عام انتخابات کی دھوم مچی اور کانگریس و مسلم لیگ بڑے فریق کی حیثیت سے میدان سیاست میں آگئیں۔ حکیم اسحاق اور ان کے سیاسی رفقاء و ہمعصر مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی رہنمائی میں ضلع کے الیکشن میں مصروف ہو گئے۔ مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے الیکشن کے میدان میں خرچ کرنے کو پانچ ہزار کی رقم دی تھی۔ قاضی ہارون رشید کے گھر میں الیکشن کا دفتر قائم ہوا۔ مولوی ریاست علی ندوی انتخاب کے نگراں مقرر ہوئے۔ ضلع کو مختلف یونٹوں میں بانٹ دیا گیا۔ حکیم اسحاق کے حصّہ میں محمد آباد سگڑی اور صدر کی تحصیل میں آئی تھیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ عوامی ہمدردیاں زیادہ تھیں ایسے وقت میں جو کارکن کانگریس اور جمعیتہ کے مشترکہ پلیٹ فارم سے کام کر رہے تھے ان کی جرأت قابل داد تھی۔ اس لئے کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ اعلیٰ ذات و طبقہ کے کھاتے پیتے مسلم افراد نہ صرف پاکستان کے کٹر حامی تھے بلکہ جمعیتہ اور کانگریس کے جلسہ جلوسوں میں شریک ہونے پر ساتھیوں پر مختلف طریقوں سے پابندیاں بھی لگاتے تھے۔ حکیم صاحب نیز ان کے شرکاء و ساتھیوں کی کوششوں سے رہنمایانِ ملک و ملت کی بار بار اعظم گڈھ آمد ہوتی رہتی تھی جن میں مولانا حفظ الرحمٰن۔ مولانا ابوالوفاء۔ مولانا قاسم۔ مولانا شاہد فاخری جو راقم کے قریبی عزیز قاضی احمد حسین کے بڑے بھائی ہوتے تھے۔ اور مولانا حسین احمد مدنی کے علاوہ گووند بلبھ پنت رفیع احمد قدوائی کیشو دیو مالویہ اور کیلاش ناتھ کاٹجو قابل ذکر ہیں۔

چونکہ حکیم صاحب ایک باعزت پیشے سے منسلک تھے اور قرب و جوار کے عوام ان کے نام سے واقف تھے اس لئے ہنگاموں اور انتخابی چپقلشوں کے باوجود صرف ایک بار ناخوشگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ جب حکیم اسحاق انتخابی مقاصد کے تحت جیراج پور گئے تو ان کی کار پر عوام نے پتھراؤ کر دیا اور یہ اور ان کے ساتھی موٹر سے نہ نکل سکے اور الٹے پیروں ساتھیوں کے ساتھ واپس آگئے۔ ان حالات میں ۱۹۴۵ء کے ہنگامی انتخابات میں ان کی پارٹی کو ہزیمت اٹھانی پڑی کیونکہ ایسے پُر آشوب دور میں چہار جانب مسلم لیگ کا غلبہ تھا۔ لیکن یہ عارضی الیکشن کے نتائج ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکے چنانچہ نئے

عزم و حوصلے کے ساتھ یہ اور ان کے ساتھی پھر کانگریس اور جمعیتہ کے لئے کام کرنے میں پوری تندہی سے لگ گئے۔

ایسے وقت میں حکیم اسحاق نے اکابرین ملک و ملت سے بہت فیض اٹھایا جن کے نام درجِ ذیل ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا حفظ الرحمن۔ مولانا شاہد فاخری مولانا ابو الوفا۔ مولانا قاسم۔ عبدالحمید الحریری جو اہلِ علم تھے اور جدہ میں حکومتِ ہند کی جانب سے سفارت خانے پر دو تین سال تک کلچرل اتاشی کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے اور پنڈت نہرو کے مجموعہ مکاتیب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ محمد انس خان۔ عبدالکریم خان مولوی فریدالدین وکیل حافظ نصر الحق۔ شاہ اسحاق وکیل حافظ عبدالحمید وکیل۔ شاہ فیضان احمد وکیل ڈاکٹر عبدالرؤف۔ محمد یحییٰ خاں فتح پوری۔ نجم الدین اصلاحی بابو سراج الحق۔ ماسٹر محمد شفیع قابلِ ذکر ہیں۔

الیکشن اور مطب :۔

۱۹۴۵ء کا الیکشن میں بڑی رنجشیں ہو گئی تھیں۔ ذاتی طور پر کچھ لوگوں نے بیجا الزام تراشیاں اور طعنے دیئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب اپنے پیشے سے غافل نہ رہے اور مطب کے اوقات میں کسی قسم کی کمی نہ آنے دی اور اب مدت پریکٹس ۲۵ سال ہو چکی تھی۔ شہر کے بیشتر مسلمان اور ہندو خاندانوں کے معالج بن گئے تھے۔ ضلع کے بیشتر قصبات میں ان کی آمد و رفت مرضاء کے دیکھنے کے لئے ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی طبابت کو کبھی روپیہ پیسہ کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کسی مریض کو اس کی حیثیت سے باہر نسخہ لکھا۔ ان کا اپنا مطب کے سوا دوا خانہ بھی تھا لیکن کبھی کسی مریض سے یہ نہ کہا کہ دوا میرے دوا خانہ سے لو۔ مطب کی مصروفیت کے بعد جو وقت بچتا اس میں قومی اور مذہبی سرگرمیوں۔ شبلی منزل کی حاضری اور اپنے یہاں مغرب سے لے کر عشاء تک نشست میں پابندی سے شریک ہوتے۔ بعض اوقات ان مصروفیتوں میں بھی مریض آ جاتے اور بالا بالا باہر مریضوں

۔۔۔۔۔ کو دیکھنے کے لئے جانا پڑتا۔ ان کی آمدنی کا تمام تر انحصار اس فیس پر ہوتا جو باہر جاکر مریضوں سے ملتی۔ جو نسخہ مطب اور شہر میں لکھتے اس کی قیمت نہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی مجربات اور مخصوص امراض کے نسخے بہت قیمتی ہوتے ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۵ء میں ان نسخوں کی قیمت بہت ہوتی تھی لیکن انھوں نے کبھی کسی کمیشن یا معاوضے کے سبب نسخے نہ لکھے۔

ہوالشافی :۔

حسب قاعدہ کبھی کسی مریض کو حتمی فائدہ کا یقین نہ دلایا اور مریض سے صاف بتادیا کرتے تھے کہ کتنے دنوں علاج کرنا ہوگا۔ خدا کے فضل سے شفا ہو جاتی ان کے اس طریق کار نے مریضوں کو ان کا مطیع بنا دیا۔ حسب دستور مریض تحفے تحائف بھی لاتے تھے۔ مسلم مریضوں کے مقابلے ہندو مرضاء کی تعداد زیادہ تھی۔ شہر میں کئی ہندو گھرانے ایسے تھے جن کے تمام بچے اور عورتیں عمر بھر ان کی دوائیں کھاتی رہیں اور بعض بے اولاد حضرات نے حسن عقیدت میں ان سے رجوع ہوئے اور ان کے نسخوں کی بدولت وہ صاحب اولاد ہوئے۔

اسی طرح مسلمان گھرانوں میں اعظم گڈھ کا شاید ہی کوئی فرد ہو جو ان کے زیر علاج نہ رہا ہو۔

مذہبی رجحانات :۔

بچپن ہی میں حفظ قرآن کی دولت پائی تھی۔ ان کے والد نے ان کو دین کے راستے پر لگایا۔ ان کے بزرگ مولوی محمد یعقوب نے ان پر دست شفقت رکھ کر دعاؤں سے نوازا ان کے استاد مولوی خدا بخش نے ایک صالح مسلمان کی خصوصیت سے نوازا۔ استاد طب حکیم اجمل خان نے اپنی دینی و دنیاوی سنجیدگی، بردباری اور اخلاق کی خیرات ان کو دی۔ مولوی مسعود علی کی قربت نے ایک مہذب اور صاف ستھرا ماحول بخشا جس کی بدولت اسلام کے اصول ان کی زندگی کے جز بنے رہے۔ اور حالات کی مساعدت کے باوجود حج جیسے بابرکت فریضہ سے بھی سرفراز ہوئے اور اپنی جیب

د بیوی کے ہمراہ ۲۶ر اپریل ۶۰ء کو کاشی ایکسپریس سے عازم بیت اللہ ہوئے ۔

پابندیٔ مطب :۔

مطب کو بہت مشکل سے چھوڑتے تھے ۔ کانگریس کے اجلاس میں شرکت پر ناغہ ہوا ۔ اپنی دختر سلمیٰ باجی (جو راقم کے زیرِ علاج بھی رہی ہیں) کی شادی کے سلسلے میں کان پور کا سفر کار سے کیا ۔ اور سب سے طویل ناغہ دوران حج بیت اللہ ہوا ۔ یہاں تک کہ اپنے فرزندگان کی شادی میں بھی دوا خانہ کرکے اٹھے یہاں تک کہ ایک صاحبزادے کی شادی میں صرف اس لئے نہ شریک ہوئے کہ مطب کا ناغہ ہوگا اور شادی اپنے بڑے بھائی کے سپرد کردی ۔

نسخہ :۔

مریضوں کو دیکھنے کے بعد مریض تو دوا باہر سے خریدتا تھا لیکن بیشتر نسخے خود ہی لکھتے اور اتنی کثرت سے نسخے لکھتے کہ انگلیاں درد کرنے لگتیں ۔ پھر بڑے لڑکے کو نسخہ لکھنے بٹھانے لگے ۔

برتاؤ :۔

مریضوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے ۔ مریض کے حالات گاؤں اور مذہب کو ضرور پوچھتے ۔ اور نسخے ہمیشہ حسبِ حیثیت لکھتے اگر کسی مریض کا قارورہ دکھاتے وقت ان کے کپڑوں پر گر گیا ۔ یا جھنجھلاہٹ آ گئی تو ان کو ڈانٹا نہیں ۔ کبھی کسی مریض کے جھوٹ اور غلط بیانی سے متاثر نہ کرتے اور نہ ہی مطمئن ۔

نذرانے :۔

مدراس کا ایک واقعہ ہے کہ کسی آدمی نے ان کے ایک مریض سے ان کے بارے میں سنا ۔ وہ بیچارہ گٹھیا کا پرانا مریض تھا چنانچہ دوست کی وساطت سے خط لکھوایا حکیم اسحاق صاحب سے نسخہ لکھ کر بھیجا اس نے استعمال کیا اور اسے فائدہ ہوگیا ۔ لوگ

تحائف بھیجتے اور روپیہ بھی۔ جن میں سے حکیم اسحاق صاحب بعضوں کا جیب خرچ دیتے مستحقین کا حصہ نکالتے دعوتیں کرتے ان کے چھوٹے فرزند کی شادی میں ملایا سے ایک پرانے مریض نے ۵۰ روپیہ نوید میں بھیجے تھے۔

ایک بار شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر اور وہ ایک مریض کو دیکھنے گئے۔ حکیم اسحاق اور ڈاکٹر صاحب حسنِ اتفاق کہ ایک ساتھ مریض کے دروازہ پر پہنچے کہ مریض ختم ہوگیا۔ حکیم صاحب لوٹ کر اسی اکہ پر گھر آگئے اور مریض کے گھر جانے اور دواخانہ دمطب تک آنے کا کرایہ خود ہی دیا۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب نے فیس لے لی۔

یہی حال مریضوں سے فیس کا ہوتا شہر شہر سے باہر مضافات غرضکہ کہیں جانا ہو وہ کچھ طے نہ کرتے اور جو کچھ ملتا اسے بخوشی دبرضا لے لیتے۔ اگر بعض مجبور نصف دیتے اور بقیہ کا وعدہ کرتے مگر وہ قرضِ حسنہ ہوتا۔

مریض کو دور دور دیکھنے جاتے تو ٹوکری میں ناشتے دان لوٹا مصلّی اور پان کی ڈبیہ ساتھ جاتی۔ ایک بار گورکھپور ایک مریض کو دیکھنے گئے اور دوسرے دن دوپہر کو واپسی ہوسکی۔ بہت افسوس کرتے رہے کہ مطب کا ناغہ ہوگیا۔ حالانکہ گورکھپور میں مریض سے پچاس روپیہ فیس ملی تھی۔

خود طبیب تھے مگر دوا کا استعمال شاید وباید کرتے تھے۔ زندگی اتنی پابند گذارتے تھے کہ پرہیز خود بخود علاج ہوجاتا تھا۔

وضع قطع :۔

زمانۂ طالب علمی میں چوڑی مہری کا پاجامہ شیروانی اور ترکی ٹوپی لباس تھا۔ لیکن تحریکِ آزادی میں شامل ہونے کے بعد کھدر کا کرتا پاجامہ تپلی مہری کا۔ شیروانی اور ٹوپی سردیوں میں پٹو کی گرم صدری اور شیروانی ہوتی گرم چادر بھی دیسی ہوتی اور کانوں میں رومال ہوتا۔

وفات :۔

آخری دنوں میں یعنی ماہِ فروری ۱۹۷۵ء میں ۱۸ کی صبح کو ان کا ہاتھ منہ دھوکر

لٹا دیا گیا اور بڑی دختر (جو راقم کے اکثر زیرِ علاج رہی ہیں) سلمیٰ جو ایک دن قبل آگئی تھیں ان کو ناشتہ کرانے گئیں روزانہ کے معمول کی مقدار کو وہ بمشکل حلق سے اتار سکے اور جیسے ہی ان کو دودھ پلایا جانے لگا کہ آنکھیں پھیل گئیں۔ اور بڑی دختر نے ان کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ قبلہ رُخ کر دیا۔ اور ۱۸ر جنوری کی منگل کی شب میں ان کے آبائی قبرستان میں ان کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

حکیم محمد اسحاق صاحب کی شخصیت مکارمِ اخلاق اور محاسنِ صفات کا ایک عجیب وغریب مرقع ہے۔ ان کی شرافتِ نفس۔ شرافتِ ذوق اصابتِ رائے حذاقتِ فن اور استقامتِ علی الحق کا ایسا جامع اور مکمل نمونہ ہمارے اطراف میں مشکل سے ملے گا۔ حضرت مسیح الملک کے تلامذہ میں سے تھے اور نہ صرف فنِ طب میں بلکہ دیگر حیثیات سے استاد کے آئینۂ کمال تھے۔

ان کے انتقال پر حکیم صاحب کے دوست منشی معین الدین حنیف نے جو اشعار اور مادّہ تاریخ کہا ہے وہ ذیل میں درج ہے۔

وہ حافظ حکیم آہ اسحاق مرحوم — گلستانِ عالم میں جواب نہیں ہے
بڑے متقی اور بڑے پارسا تھے — جواب ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے
جو اس طرح کر لے مسخر دلوں کو — طبیب ایسا کوئی جہاں میں نہیں ہے
مریضوں پہ رکھے جو چشمِ عنایت — کوئی نیک اوصاف ایسا نہیں ہے
اٹھارویں وہ فروری کی وہ منگل کا دن — گھڑی جس کی ہر ایک غم آفریں ہے
وہ اب ہو کے بازارِ عالم سے رخصت — پیشِ خداوند جانِ آفریں ہے
وہ انسانِ کامل پرستارِ دین وہ — جواب زیبِ باغ بہشتِ بریں ہے
جدائی میں دن رات افسوس ان کی — غم آلودہ میرا یہ قلب حزیں ہے
کرے مغفرت ان کی پروردگار — یہی التجائے دلِ کمتریں ہے
لکھا از رہِ ابجد سن عیسوی میں — پریشان عبث تو مصنف حزیں ہے

تھا مشہور عالم جو اسحاقِ نامی
چراغِ ہدایت وہ زیرِ زمیں ہے
۶۷۵

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی

۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹۰۰ء — ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء

خاندانِ عزیزی کا پہلوان حکیم

تاریخ طب میں خاندان عزیزی کا ایک بلند و برتر مقام ہے۔ جب بھی کوئی مورخ ہندوستان کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ خاندان عزیزی جس کے بانی حکیم محمد یعقوب تھے اور جو حکیم محمد عبدالعزیز کے نام سے خاندان عزیزی سے منسوب ہوا، خاندان عزیزی کی خدمات کو فراموش نہ کر سکے گا۔

دلی کے بعد لکھنؤ کو ملک کی طبی دنیا میں جو مقام و اہمیت حاصل ہے وہ ملک کے کسی شہر کو حاصل نہیں ہے اور لکھنؤ کے طبی خانوادوں میں جو مرکزیت شہرت و اہمیت خاندان عزیزی کو حاصل ہے وہ مرتبہ کسی دیگر خاندان کو حاصل نہیں ہے۔

عبداللطیف فلسفی خاندانِ عزیزی کے آخری نمائندہ طبیب تھے۔ اگر وہ ایک جانب ظرافت کا نمونہ تھے تو دوسری جانب تحمل، بردباری اور سنجیدگی متانت کا پتلا تھے۔ فن ورزش کے جتنے ماہر تھے اتنے ہی دیگر علوم و فنون میں قابل تھے۔

خاندان :-

ان کا خاندان جھوائی ٹولہ لکھنؤ کا مشہور طبی خانوادہ خاندان عزیزی ہے۔ ان کے اجداد کشمیر سے ترک وطن کرکے لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے والد کا نام

جناب شفاء الملک پروفیسر حکیم عبداللطیف فلسفی پرنسپل
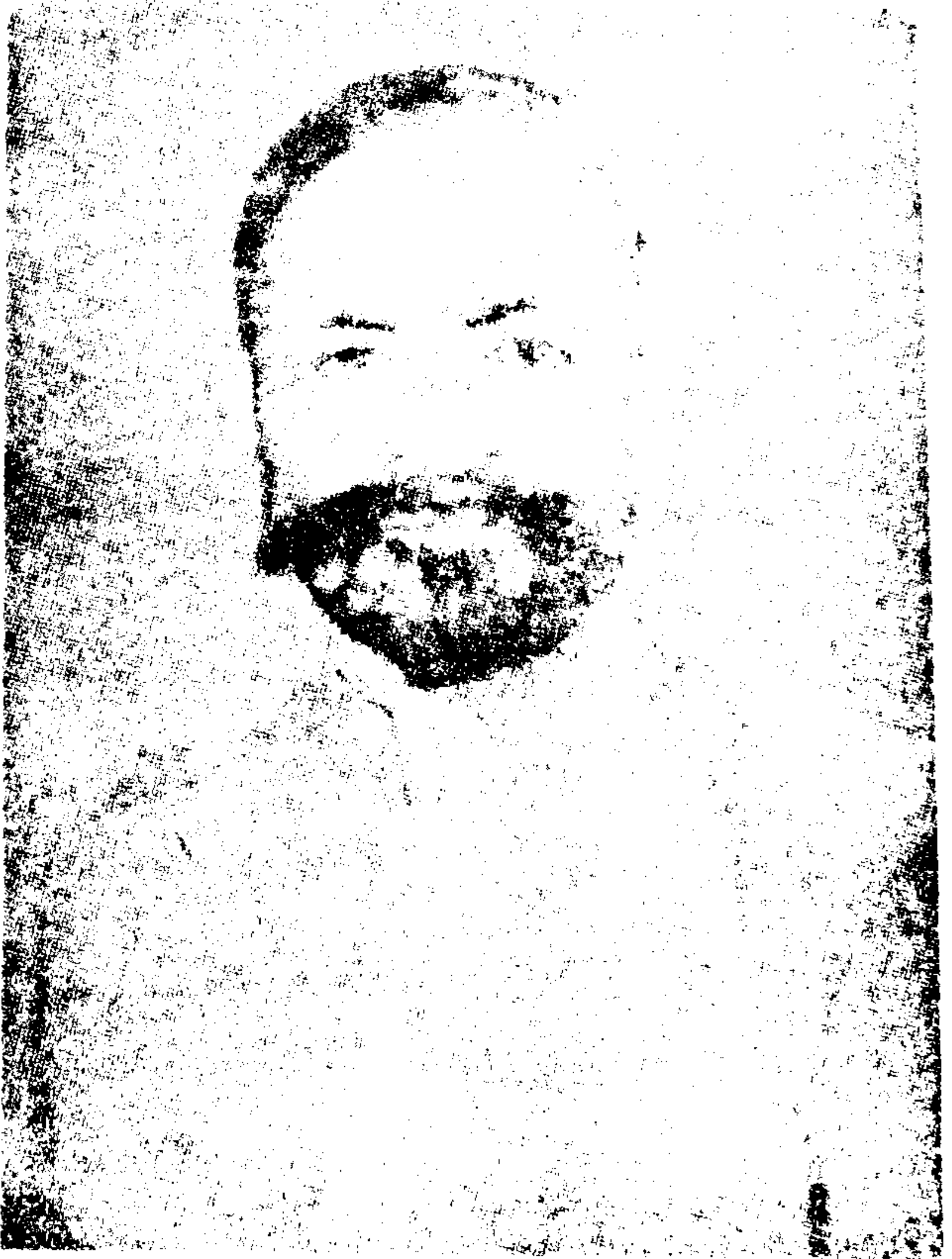
حکیم عبدالوحید تھا، جو معروف طبیب تھے۔

پیدائش :۔

عبداللطیف کی پیدائش ۱۰ محرم الحرام ۱۳۱۸ھ ہجری مطابق ۲۹ اپریل ۱۹۰۰ء عیسوی بعد نماز جمعہ لکھنؤ میں تولد ہوئے۔ مفتی عبداللطیف ان کے والد کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور اپنے وقت کے جید عالم۔ ان کے نام نامی و اسم گرامی پر خاندان نیز گھر کے دیگر افراد نے ان کا نام بھی تبرکاً عبداللطیف ہی رکھا

ابھی ۲ سال کی عمر کے ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔

تعلیم و تربیت :۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد ان کے چچا حکیم حاجی عبدالعزیز جو اپنے وقت کے نہ صرف لائق و فائق طبیب تھے بلکہ طبی درسگاہ تکمیل الطب کے بانی بھی تھے) نے ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی ان کے والد ماجد حکیم عبدالوحید کا انتقال مرض طاعون جس نے ایک وقت میں صوبہ اودھ نیز متعلقہ اضلاع میں لاکھوں لوگوں کو لقمۂ اجل بنایا تھا میں ایک مریض کو ملاپور دیکھ کر آنے کے بعد ہوا تھا ابھی عم محترم حکیم عبدالعزیز کا سایۂ عاطفت گیارہ سال ہی ملا تھا کہ نئے سرپرست بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ چچا کی وفات کے بعد بڑے بھائی شفاء الملک حکیم عبدالمعید نے اپنی سرپرستی میں لیا۔ اور تعلیم و تربیت کی جانب متوجہ ہوئے۔

زمانہ کے دستور اور رواج کے مطابق تعلیم کی ابتدا گھر کے علمی و ادبی ماحول سے شروع ہوئی۔ لکھنؤ میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ مولانا عبدالشکور جو مدرسہ فرقانیہ میں مدرس اعلیٰ بھی تھے ان سے اور شمس العلماء مولانا عبدالمجید فرنگی محلی اور مولانا عبدالکریم (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فقہ کے استاد اعلیٰ تھے) سے حاصل کی۔ پھر اپنے خاندان کی روایات کے برعکس پہلی بار خاندان کے کسی فرد کا بغرض حصول تعلیم وطن مالوف سے باہر کسی شہر کا سفر کیا۔

۱۴ ۱۹ء میں رام پور جا کر مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے درسیات کی تکمیل اور خصوصی طور پر استفادہ کر کے فاضلِ معقولات کی سند حاصل کی۔

طبی تعلیم :-

۱۷ ۱۹ء میں واپس رام پور سے آکر اور درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد فنِ طب جو ان کے خاندان کی معراج تھا اس کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔
۱۹۲۱ء میں طبی تعلیم سے فراغت کے بعد جو اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی تھی۔ لکھنؤ میں ہی مستقل مطب کے ساتھ مادرِ علمی تکمیل الطب میں درس و تدریس کا شغل شروع کیا۔

دیگر علوم :-

حکیم عبداللطیف فلسفی کو فنونِ لطیفہ میں خطاطی موسیقی اور مصوری کے ساتھ ساتھ فنِ کشتی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور ہر فن کو باقاعدہ اُس فن کے ماہر اور استاد سے حاصل کیا۔ جب طب کی کتاب نبض کی تصنیف و تالیف میں منہمک تھے موسیقی اور نبض کے موضوع پر جب پہنچے تو اپنی موجودہ تعلیم سے مطمئن نہ ہو کر پہلے تو شرح قانونِ آملی کا مطالعہ کیا وہاں بھی جب تسلی نہ ہوئی تو علی گڑھ میں فنِ موسیقی کے استادِ کامل مولا بخش شاگردِ رشید ظہور حسین خان نائک خواجہ سے دو سال تک فنِ موسیقی کی مشق کر کے خواجہ محمد اشتیاق سے اس فن کی تکمیل کی۔
پھر علی گڑھ میں ہی فنِ مصوری کی باقاعدہ مشق سجاد صاحب آرٹسٹ مسلم یونیورسٹی سے سیکھی ان کی چند تصاویر آرٹ کا بیش قیمت نمونہ ہیں۔ اور بطورِ یادگار آج بھی محفوظ ہیں۔
ورزش اور کثرت ان کا محبوب شغل رہا تھا۔ دورانِ قیام رام پور استاد سہراب خان کے شاگردِ رشید رہے اور علی گڑھ میں جب کہ یہ درس و تدریس جیسے معزز پیشہ سے اور وہ بھی طب کے جیسے فن کے پیشے سے منسلک اور وابستہ

تھا فیکلٹی آف میڈیسن کے دوسرے ڈین آپ عرصہ تک رہے۔ حکیم عبداللطیف یونی ورسٹی طبیہ کالج کے بہت ذہین اور باصلاحیت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔

آپ اپنی ذاتی شخصیت اور پر وقار حیثیت کی بنا پر یونیورسٹی اور علی گڑھ میں بہت مقبول ہو گئے تھے جس کی بنا پر بہت سے اہم عہدوں پر رہے آپ کی مصروفیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو گا کہ آپ علی گڑھ مندرجہ ذیل متعدد اہم عہدوں پر عرصہ تک فائز رہے۔

۱۔ لیکچرار طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۳۔ پروفیسر طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۴۔ ڈین فیکلٹی آف میڈیسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۵۔ صدر طبی سوسائٹی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۶۔ ممبر منیجنگ کمیٹی دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۷۔ ممبر اکیڈمک کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۸۔ ممبر ایگزیکٹو کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۹۔ ممبر آف کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۱۰۔ ڈائریکٹر آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن۔

۱۱۔ ٹریژرار جامعہ اردو علی گڑھ۔

۱۲۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے جوائنٹ سکریٹری۔

۱۳۔ ممبر نمائش کمیٹی علی گڑھ۔

۱۴۔ وائس پریسیڈنٹ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس۔

حکیم صاحب یونیورسٹی کے بہت ہی ذمہ دار فرد تصور کئے جاتے تھے وہ یونیورسٹی کی تمام اہم کمیٹیوں میں شریک ہوتے تھے۔ الیکٹرک کونسل اور کورٹ کی میٹنگوں میں ان کی تقاریر بہت زوردار ہوتی تھیں۔

ملک کے تقریباً تمام طبی تعلیمی اداروں سے شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کا کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق تھا اور وہاں کے معاملات میں ان کے اہم مشوروں کو دخل

رہتا تھا۔ طبیہ کالج علی گڑھ کے علاوہ آپ تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے ممبر معتمد اعزازی اور آخر میں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ آیورویدک کالج قرول باغ دہلی کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر پٹنہ طبیہ کالج کی مجلس مشاورات کے ممبر جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل جامعہ طبیہ دیوبند کی مجلس طبی کے صدر نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے سلسلے میں قائم کردہ ملکوٹے کمیٹی کے ممبر بھی رہے تھے سری نگر (کشمیر) میں طبیہ کالج کا قیام آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی جانب سے مقرر کردہ نصاب کمیٹی کے کنوینر کے ساتھ ساتھ یونانی ایڈوائزری کمیٹی۔ پلاننگ کمیٹی فارماکوپیا کمیٹی۔ سینٹر کونسل آف انڈین میڈیسن سینٹرل کونسل فار ریسرچ آف یونانی میڈیسن۔ اور ہومیوپیتھی کی گورننگ اور ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر اور اتر پردیش پبلک سروس کمیشن کی تقرراتی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔

سرکاری سطح پر ہمیشہ حکیم صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں حکومتِ برطانیہ نے آپ کو "شفاء الملک" جیسے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

شفاء الملک کے خطاب پر ملک کے طبی و ادبی حلقوں میں نہایت مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ادارہ طبیہ کالج میگزین علی گڑھ نے اپریل ۱۹۴۱ء مندرجہ ذیل الفاظ میں مبارکباد پیش کی تھی۔

"ہم بصد فخر و مباہات۔ مُبدع قوانین شفا مخترع آئین دوا۔ مجمع ملکات قدوسی۔ منبع معالجات جالینوس۔ عالیجناب شفاء الملک حکیم محمد عبداللطیف صاحب فلسفی کی خدمت گرامی میں موصوف کے اعزازی خطاب پر پُرخلوص ہدیۂ تبرک پیش کرتے ہیں۔"

اعزازی طبیب صدر جمہوریہ ہند:۔

حکیم عبداللطیف فلسفی کی گوناگوں مصروفیات و خدمات اور طبی لیاقت اور حذاقت کی بنا پر حکومتِ ہند نے ان کو صدرِ مملکت جیسے معزز عہدے کا دوبار طبیبِ خاص مقرر کیا۔

ایک بار ان کے قریبی رفیق ڈاکٹر ذاکر حسین سابق وائس چانسلر کے صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر ان کا دوسری بار صدر جمہوریہ عزت مآب وی۔ وی گری کا معالجِ خاص

خاص مقرر کیا۔

حکیم سید شاہد علی بدایونی کراچی شہید نے ان کو مندرجہ ذیل اشعار میں تہنیت پیش کی۔

صدر بھارت نے طبیب اپنا بنا کے آپ کو — طبِ یونانی کی گویا سرپرستی کی قبول
اس کو کہتے ہیں خداوندِ عالم کا کرم — اس توجہ کی مبارک آپ کو شان نزول

اس کے ساتھ ساتھ متعدد ادبا، و شعراء نے ان کو مبارکبادیں پیش کی تھیں جن میں چند خاص خاص اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

بقول حکیم یوسف صدیقی یوسف کے۔

بہارِ خوشی گلشنِ طب میں آئی — بنے گل چمن میں کلی مسکرائی
صدا دی یہ بلبل کے شاخِ چمن پر — جگہ فلسفی نے حکومت میں پائی
مبارک ہو اے ماہرِ فنِ حکمت — خدا کے کرم سے ملی ہے یہ عظمت
طبابت نہ کیوں آپ پر ہو نازاں
جو ہاتھوں میں ہے نبضِ صدرِ حکومت

مشہور شاعر محمد میاں افضل کے اشعار جو انھوں نے حکیم عبد اللطیف فلسفی کی خدمت میں پیش کئے۔

خدا داد ذہن رسا تم نے پایا — ہر اک گام پر مرتبہ تم نے پایا
تمہیں اک عہدہ ملا شانِ والا — مفادِ ہنر بر ملا تم نے پایا

شفاء الملک مرحوم اطباء قدیم کی روایات اور فنی عظمت کا بے مثل نمونہ تھے قدیم سائنسی موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور فنِ طب کے ذخیرہ پر اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ ملک کے صنعتی مسئلہ کو طبِ یونانی کے ذریعہ حل ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے زندگی بھر جد و جہد کی۔ ان کا کوئی وقت ذاتی یا گھر کے لئے نہیں تھا۔ وہ ہر لمحہ علمی مباحثہ تعلیمی معاملات اور طب کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے مصروف رہتے تھے۔ وہ نہ صرف قدیم بقراطی طب کے علمبردار تھے۔ بلکہ انھوں نے فنِ نسخہ نویسی کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ مریض کے جملہ حالات اور مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے مفردات پر مشتمل نسخہ تجویز کرنا ان کا طرۂ امتیاز

تھا۔

تصانیف :۔

آپ کی تصانیف کی فہرست طویل ہے جن میں ادبی مذہبی اور طبی ہیں۔
آپ کے مقالات میگزین طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دیگر طبی رسائل میں شائع ہوتے رہے آپ کے اکثر مضامین "تجدید طب" کے موضوع یا "طب میں ریسرچ" کے موضوعات پر شائع ہوتے رہے تھے۔ طبی کانفرنسوں کے لئے آپ نے خطبات بھی لکھے ہیں۔ جو طبی تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔
حکیم صاحب کی کاوشوں سے طبیہ کالج علی گڑھ سے ۱۹۳۲ء سے ایک ماہنامہ میگزین کا اجراء ہوا جو جلد ہی سہ ماہی رسالہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس رسالہ کا مدیر کوئی استاد ہوتا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اس رسالہ میں طلباء کو بھی شامل کیا گیا ۱۹۴۲ء میں اس میگزین کو طبی سوسائٹی کے سپرد کیا گیا اور اس رسالہ کا نام طبی سوسائٹی میگزین رکھا گیا۔ مقالات و خطبات کانفرنس کے علاوہ آپنے طبی کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

طبی تصانیف :۔

۱۔ تاریخ طب۔
۲۔ ہماری سائنٹفک طب یونانی۔
۳۔ تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال۔
۴۔ التحقیق المطلوب فی الماء المشرب۔
۵۔ طبی ڈائری۔
۶۔ مختصر تاریخ قدیم تشریح۔ منافع الاعضا و علم الجراحت۔
۷۔ ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا۔
۸۔ طب اور سائنس۔
۹۔ نبض۔

۱۰۔ ترجمہ و شرح ادویہ قلبیہ مصنف شیخ بو علی سینا۔

مذہبی تصانیف اور مذہبی رجحانات :۔

چونکہ حکیم صاحب گہرے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے اور ان کی مذہبی معلومات بہت وسیع تھیں قرآن اور حدیث کا مطالعہ آخر عمر تک رہا ان مذہبی معلومات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہو جائے گا۔

مشہور ناقد اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی تفسیر ماجدی پر ایک تبصرہ مولانا کے داماد اور بھانجے حکیم عبد القوی دریا آبادی کے اب کے صدق جدید میں میں حکیم صاحب کے تبصرہ میں مولانا نے پوری وسعت قلبی سے حاشیہ میں ان کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

اسی طرح مولانا منظور نعمانی نے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ درک حدیث میں ان کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔

"اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے کبھی کبھی قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کے بارے میں تحریری مراسلات بھی فرماتے مولانا منظور نعمانی کی تالیف معارف الحدیث کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور مولانا حکیم صاحب کی خدمت میں ہدیتاً ان کو بھیجتے تو حکیم صاحب اس کتاب کا ہفتہ عشرہ میں ہی مطالعہ کر لیتے اور اس طرح مطالعہ کرنے کہ کتابت وطباعت کی غلطیوں کی جانب بھی متوجہ کر دیتے تھے تاکہ آئندہ کتابت وطباعت کی غلطیوں کا تدارک کیا جا سکے۔

صوم وصلوٰۃ اور وظائف کا اہتمام فرماتے تھے پہلے حضرت میاں [illegible] سے بیعت ہوئے بعد ان کے انتقال کے مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی دیوبندی [illegible] سے چند سال قبل مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی سے بیعت ہو گئے تھے۔

یہی بنا تھی کہ خالص طبی حیثیت سے معروف ہونے کے بعد بھی مولانا کا مذہب میں عملی دخل بہت تھا اور ساتھ میں مذہبی معلومات بھی۔

مندرجہ ذیل مذہبی تصانیف ہیں۔

۱۔ فلسفۂ نبوت

۲۔ راضیہ مرضیہ۔
۳۔ مذہب اور لامذہبیت۔

اس کے ساتھ ساتھ طبی تحقیقات اور ریسرچ کے خیال سے آپ نے کتب خانے میں متعدد اضافہ کیا۔ اکثر نادر و نایاب طبی کتب آپ ہی کی کوشش سے طبیہ کالج میں فراہم ہوئیں اور یہ کتب خانہ تحقیقی نقطۂ نگاہ سے ایک قابلِ قدر کتب خانہ بن گیا۔ پینسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کی صحت قابلِ رشک تھی۔ بقولِ خود حکیم عبداللطیف کے۔

"اس زمانے میں شانوں اور بازؤں میں لعاب خوب تیاری پر تھا۔"

اور یہ صحت کا کرشمہ ان کی صحت اور ذوق و شوق و جثہ سے نمایاں تھا۔ نمائش دنگل علی گڑھ کے وہ ہمیشہ جج ہوتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ کی نمائش میں جرمن کے مشہور پہلوان زبسکو اور رستمِ زماں گاما پہلوان کی نمائش گراؤنڈ میں جو تاریخی کشتی ہوتی تھی اور اس کشتی میں بھولو پہلوان کا نمائندہ گاما اس جرمن پہلوان سے ایک گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد جیتا تھا اس تاریخ ساز کشتی کے بھی حکیم صاحب جج تھے۔

چونکہ آپ طب اور فلسفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور آپ کا ہر مضمون و لیکچر طبی فلسفہ میں ڈوبا ہوتا تھا۔ اسی بنا پر آپ فلسفی کے خطاب سے معروف ہوئے۔

وفات :۔

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی ۱۹۶۱ء میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء میں جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل مقرر ہوئے یہیں پر آپ پر قلبی امراض شروع ہوئے۔ جس کی بنا پر مستعفی ہو کر اپنے وطن لکھنؤ پہنچے اور اپنا آبائی و اجدادی مطب جھوائی ٹولہ میں سنبھالا۔ اسی دوران مرض نے غلبہ کیا اور بالآخر یہ آفتابِ علم ۱۳۔۱۴۔ نومبر ۱۹۷۰ء مطابق ۱۲، ۱۳ رمضان ۱۳۹۰ھ کی درمیانی شب میں اپنی گردشِ حیات پوری کر کے دامنِ لکھنؤ میں غروب ہوا۔

ان کے انتقال کے بعد دنیائے طب میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ شعراء و ادباء و اطباء نے اپنے اپنے طرز پر نذرانۂ عقیدت پیش کئے۔

قطعات تاریخ وفات۔

از حکیم نور العین حسن راغب۔

عبد اللطیف فخر اطبائے روزگار — نازاں تھا جن کی ذات پر ہر جوہر و کمال

استادِ طب مصنف و ذخار فلسفی — جوہر کمال فن میں تھے یکتا و بے مثال

افسوس وہ طبیب کہ شیخ الرئیسِ وقت — دارِ بقا کو کر گئے ناگاہ انتقال

راغب سنِ وفات یہ ایمائے غیب ہے — عبد اللطیف واصل درگاہ ذوالکمال

حکمت پناہ وقت حذاقت مآب عصر
رو پوش گشت حیف چو ام و زیر خاک
تاریخ انتقال بگو راغب حزیں
عبد اللطیف شد بجوار خدائے پاک

۱۳۹۰ھ

حکیم نثار احمد علوی نے کراچی سے مندرجہ ذیل اشعار بطورِ قطعات کہے۔

پھٹ پڑا سلسلۂ کوہِ گراں ہے اے دوست
کہ نہ دل ہے نہ جگر اور نہ جاں ہے اے دوست
شیخ دوراں وہ لطیف آہ کہاں ہے اے دوست
مضطرب خلق ہے جب سے وہ نہاں ہے اے دوست
ہیں پریشان ہر اک شہر مریضوں کے گروہ
جس کی چٹکی میں شفا تھی وہ کہاں ہے اے دوست
جس کے اخلاص و محبت کی قسم کھاتے تھے
اب وہی رونق بزم اور گراں ہے اے دوست
اٹھ گیا ہائے جو تھا ہند میں رازی کی مثال
کون عالم میں نہیں گریہ کناں ہے اے دوست
مسند علم سے خالی ہے چھوائی ٹولہ
ایسا پردے میں گیا شیخ زماں ہے اے دوست

سر سے شاگردوں کے سایہ جو اُٹھا ہے اُن کا
زندگی ان کے لئے بارِ گراں ہے اے دوست

پسماندگان و شاگردِ رشید :-

حکیم صاحب کی شادی ۱۹۱۷ء میں ان کی منجھلی خالہ کی چھوٹی صاحبزادی راضیہ بیگم بنت منشی سید محمود حسین سے ہوئی تھی۔
ایک صاحبزادہ احمد سعید اور دو صاحبزادیاں حمیرہ بیگم اور شاہدہ بیگم ان کی یادگار ہیں۔
اور شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو آج بھی ملک کے مختلف مقامات پر متعدد اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

طبی معرکے :-

حکیم عبداللطیف کے علاج و معالجہ طبی مشاہداتِ اور تجربات پر کئی کتب ان کے شاگردوں نے سپردِ قلم کی ہیں۔ لیکن چند ایسے واقعات جو مخفی اور تاریخی ہیں ذیل میں تحریر ہیں۔

(۱) ایک بار ایک نواب صاحب کی دختر حکیم صاحب کے مطب میں تشریف لائیں۔ ان کے پیر میں ایک سفید داغ تھا حکیم صاحب نے جن کا مطب مرجع خاص و عام تھا ان دختر نواب صاحب کو برص تجویز کر کے مندرجہ ذیل نسخہ لکھوایا۔
بابچی سرسوکہ ہلیلہ سیاہ۔ گل حنا۔ گل نیم۔ چوب چینی۔ ہر ایک ۶ ماشہ کوٹ کر رات کو گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح مل چھان کر ۲ تولہ خالص شہد ملا کر پلائیں اور ایک لیپ۔ (ضماد)
بابچی بار سنگھار کی ڈنڈی سرمہ اصفہانی تخم پنواڑ۔ کبریت۔ عاقرقرحا۔ ہم وزن باریک کر کے سرکۂ خالص میں پیس کر ضماد تیار کریں اور داغ پر کئی بار ملیں۔
تقریباً دو ڈھائی مہینہ یہی نسخہ استعمال میں رہا۔ پھر مریضہ نے مطب میں آکر بتایا کہ اب طبیعت میں بوجھ اور کسل نہیں ہے اور سفید داغ مٹ کر جلد کے مشابہ

ہو گیا ہے۔
ایک مرتبہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب اپنے بچہ کو لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ نہ صرف شہر بلکہ بیرونِ شہر کے ڈاکٹروں کو بھی دکھا چکے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب ڈاکٹروں نے آخری علاج آپریشن تجویز کیا ہے۔
حکیم صاحب نے پروفیسر صاحب کے اس پانچ سالہ بچہ کا بغور معائنہ کیا اور مطب میں موجود شاگردوں کو بھی بچے کو دکھا کر ورم لوزتین (ٹانسلز) تجویز کیا۔ اور مندرجہ ذیل نسخہ لکھا یا۔
لعوق خیارشنبر ۵۔ ۵ ماشہ دن میں کئی بار چٹائیں اور مغز املتاس ۵ تولہ کو پانی میں اتنا پکائیں کہ ½ پاؤ پانی رہ جائے۔ اب پھر ۲۰ تولہ اس پکائے ہوئے پانی میں ۲۰ تولہ دودھ ڈال دیں اور اتنا پکائیں کہ سب ۱۵ تولہ رہ جائے یعنی سب کا نصف اب اس چھانی ہوئی دوا، سے غرارہ کرائیں۔ پروفیسر صاحب کو یہ نسخہ ایک ماہ استعمال کرانے کی ہدایت کی۔
پروفیسر صاحب جاتے جاتے پوچھنے لگے کہ حکیم صاحب ٹھیک ہو جائیگا؟ میں ماہر گلہ کو بچہ کو دکھا چکا ہوں۔ حکیم صاحب نے تسلی اور تشفی دینے کے بعد کہا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہو گا۔
انشاء اللہ لفظ کی برکت حکیم صاحب کے ہاتھ میں دستِ شفا اور نسخہ کی معقولیت کہ ایک ماہ میں بچہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

پدم شری حکیم ہمدرد ۱۹۰۸ء

حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی

بھارت میں کاروانِ طب کا سپہ سالار

آج ہندوستان میں طبِ یونانی کی اہمیت اور افادیت۔ گہرائی اور گیرائی سے اگر کوئی واقف ہے تو وہ طبِ یونانی کی گراں مایہ۔ گراں قدر مایۂ ناز ہستی حکیم عبدالحمید سے بھی واقف ہوگا۔

تاریخِ طب میں جس طرح نامی گرامی ہستیاں قابلِ قدر شخصیتیں معروف حکماء مشہور اطبّا ہوئے ہیں اور آج ہمیں ان کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ سوچنے اور خیال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ایسے بھی تھے۔ کیسے ہوں گے یہ ذی علم؟

ایسے لاتعداد سوالوں کے جواب میں موجودہ دور کے صرف ایک فرد کو سامنے اگر کر دیا جائے تو انسانی ذہن خود بخود یہ حقیقت سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہو جائیگا۔

حکیم حاجی عبدالحمید کی ذاتِ گرامی ایسی ہی ہے جیسی تاریخ کے اوراق میں قصّہ پارینہ بن چکی ہوتی۔ تاریخ حکیم عبدالحمید فردِ واحد ہے مگر اپنی ذات میں ایک انجمن۔

تاریخ میں ایسی بہت کم ہستیاں ہوئی ہیں جن کو ان کی حیات ہی میں شہرتِ ابدی مل گئی ہو۔ حکیم عبدالحمید بھی ان کمیاب ہستیوں میں ایک ہستی ہے جس نے صلہ و ستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہو کر طبِ یونانی اور ہندوستان کے غرباء کی خدمت کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔

الحاج حکیم عبدالحمید صاحب

ماضی کے بقراط۔ افلاطون۔ ارسطو۔ جالینوس۔ بوعلی سینا اور رازی کی مشترکہ مساعیٔ جمیلہ کی اگر کوئی شکل بنتی تو وہ حکیم عبدالحمید کی محنت اور کوششوں کا مجموعہ ہوتی۔

ہندوستان میں طب یونانی کو زندہ و پائندہ رکھنے والا اگر کوئی فرد ہے تو تو وہ حکیم حاجی عبدالحمید کی شکل میں موجود ہے۔

خاندان :۔

حکیم عبدالحمید صاحب کے اجداد چینی ترکستان کے مشہور شہر کاشغر سے سترھویں صدی کے شروع میں ترکِ وطن کر کے پشاور شہر کو انتقال کیا۔ یہ مہاجرین اجداد تجار تھے۔

وطنِ اوّل بھی ترکستانِ چین اور کاشغر میں ان کے آباؤ اجداد کا فنِ معاش اون اور قالین سازی تھا۔ کچھ افرادِ خاندان کپڑوں کی تجارت سے بھی وابستہ تھے۔ پشاور میں ان کے خاندان کے بزرگوں کا قیام قریب قریب پون صدی سے زیادہ رہا۔ جس میں بزرگ قدیم روایات اور پیشہ سے منسلک رہے اور کچھ نے پیشہ خشک فروٹ کی خرید و فروخت کا اختیار کر لیا تھا تو کچھ پنساری یا دیگر کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے وقفے تک یہ بزرگ ملتان میں بھی مقیم رہے تھے۔

حکیم عبدالحمید کے پردادا نے صوبۂ ملتان اور پنجاب میں سیاسی تغیرات اور اتھل پتھل کے بعد اٹھارویں صدی کی دوسری دہائی کے قریب فکرِ معاش اور استحکامِ معاش کی تلاش میں ہندوستان کی سلطنت دہلی کا رُخ کیا اور دارالسلطنت دہلی کے محلہ حوض قاضی جیسے تاریخی مقام میں فنِ عطاری اور پنساری ہٹا کی دو دکانوں سے خورد و نوش کا انتظام کرنا شروع کیا۔ ہنگامۂ غدر کی آمد آمد کی خبر سن کر مورثِ اعلیٰ پانی پت منتقل ہو گئے جہاں حکیم عبدالحمید کے دادا حافظ شیخ رحیم بخش کی پیدائش ۱۸۶۴ء میں اور نانا شیخ کریم بخش کی پیدائش ۱۸۶۱ء میں ہوئی۔ حسنِ اتفاق دونوں عزیز برادر تھے۔ شوقِ سیاحی اور جہاں گردی

کے سبب شیخ رحیم بخش اودھ کے شہر پکلی بھیت منتقل ہو گئے ذریعہ اور سلسلۂ نسب کے لئے ایک بزرگ کے خاندان اور کاروبار سے منسلک ہو گئے۔

یہیں ان کے والدِ بزرگوار حکیم عبدالمجید اور چچا حافظ عبدالرشید کی ولادتِ باسعادت بالترتیب ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۶ء کو ہوئی۔

اور کچھ عرصہ کے بعد دادا اپنی اولادوں کے ساتھ مسکنِ قدیم حوض قاضی میں آکر مقیم ہو گئے ان کے والد کی تعلیم و تربیت ہونے لگی یہیں انھوں نے فنِ عطاری اور دوا سازی کی تربیت حکیم اجمل خاں کے ادارہ ہندوستانی دوا خانہ میں حاصل کیں اور دوا خانہ کو ایک نئی شکل انجام دیں۔ اس دوا خانہ میں ان کے والد کو طب کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا وقت ملا۔ اور بعد میں ایک نیا حوصلہ امنگ اور جوش لے کر اپنی تمام دیانت داریوں اور ایمانداریوں کی عظمتوں کے ساتھ ہندوستانی دوا خانہ سے الگ ہو کر ایک عظیم کام کے لئے سینہ سپر ہو کر حوض قاضی میں ایک چند فٹ کی دوکان میں دوا خانہ کا کام عطاری سے شروع کیا۔

پیدائش:۔

عبدالحمید کی پیدائش بمقام دہلی ۱۴ ستمبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۷ شعبان ۱۳۲۶ھ کو ایک نہایت ماہر و کامل خاندانِ طب جس کی رگ رگ میں فنِ طب کا خون رواں دواں تھا آنکھ کھولی۔ اور پروان چڑھتے چڑھتے فنِ عطاری کے رموز و نکات سے واقف ہو گئے۔ کیونکہ آنکھ کھولتے ہی والد کی ہدایت اور دین کی رغبت کی بنا پر فن میں کامل دستگاہ حاصل کر لی تھی۔

تعلیم و تربیت:۔

بچپن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور شوق و لگن کے بعد ابھی سن بلوغت کی جانب قدم اُٹھا ہی رہے تھے ناگاہ ۱۳ اور ۱۴ سال کی عمر کے درمیان والدِ ماجد داغِ مفارقت دے گئے۔ اور ذمہ داریوں کا بوجھ ناتواں کاندھوں پر آن پڑا۔

آپ نے طبیہ کالج دہلی سے بقول جلال الدین فرزندِ علامہ حکیم کبیر الدین مرحوم

خصوصی شفقت اور مہربانی شیوخ طب حکیم محمد کبیر الدین صدر الاطبا و حکیم محمد الیاس خاں و حکیم فضل الرحمان کی خصوصی مہربانی سے سند طب حاصل کی۔

خدمات :-

دستور زمانہ ہے کہ ہر بڑی ہستی خادم کے بعد مخدوم کے درجۂ کمال کو جا پہنچتی ہے لیکن عبدالحمید کی ذات صفات پر یہ کلیہ صادق نہیں آتا ہے لیکن آج بھی پیرانہ سالی کے باوجود وہ مجسم خدمات کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

۸۰ سال سے زائد عمر کے باوجود جس تندہی جانفشانی۔ محنت۔ لگن اور سب سے بڑھ کر پابندیٔ وقت سے اپنے دن تمام کے تمام کام کاج انجام دیتے ہیں وہ قابلِ رشک ہے۔

صحتی اخلاقی۔ تمدنی اور فنی نقطۂ نظر سے آپ نے جہاں بے شمار خدمات انجام دی ہیں وہاں پابندی وقت سے ۱۹۳۰ء سے دہلی میں مطب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جاڑا، گرمی بہار اور موسم برسات غرضیکہ کوئی بھی موسم ہو آپ اپنے وقت معینہ پر دواخانہ ایسے حاضر ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے آنے جانے پر اپنی گھڑی کو ملا لیتے ہیں۔

ان کی پرورش و پرداخت میں ماں کی تعلیم و تربیت کا بڑا دخل تھا۔ ماں کی خدمت اور محبت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج ان کی محنت کا ثمرہ بشکل ہمدرد موجود ہے۔

ہمدرد آج نہ صرف طب کی دنیا میں بلکہ علاج و معالجہ کے میدان میں ایک معتبر و منفرد نام ہے اور حکیم صاحب موصوف تمام ملازمین ہمدرد کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے اور ان کی تمام مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بڑی لگن اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ ہمدرد کی تعمیر اور محنت و دیانتداری کو اپنا وظیفہ سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ فن دوا سازی میں ہمدرد نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک میں اپنا ایک باوقار مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ اور یہ فخر حاصل ہے کہ اس ادارے میں عمدہ خالص اور اصلی ادویات تلاش و جستجو کے بعد تیار کی جاتی ہیں۔

حکیم عبدالحمید آج فنِ طب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔
ان کو اس مقام پر پہنچانے میں چند معاونین نے ہاتھ تو بٹایا لیکن اپنی کوشش۔ عمل پیہم۔ زیادہ معاون رہی۔ والد بزرگوار کے گذرتے ہی حکیم عبدالحمید نے مسلسل محنت بھرپور توجہ۔ وقت کی پابندی اور سب سے بڑھ کر خوش اخلاقی کی بدولت ہمدرد دواخانہ کو ملک میں اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے کہ طبِ یونانی آج ہمدرد کی ذات سے پہچانی جاتی ہے۔
اس درمیان کاروبار اور فنِ طب پر کئی بار زوال آیا لیکن مسلسل جانفشانی اور مستقل جدوجہد کی بنا پر فن اور دواخانہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا۔ ان کے بھائی حکیم محمد سعید ان کے بارے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ۔
"تعلیم طبی ختم کرکے اور فراغت پاکر بھائی جان نے ہمدرد کی باگ ڈور سنبھالی لی۔ اور وہ ابّا جان کے لگائے ہوئے پودے کو اب پھل دار درخت بنانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اس حقیقت کا اظہار بیحد ضروری ہے بھائی جان کو بچپن سے ہوش سنبھالنے تک اور بڑے ہونے تک کھیل کود کے مواقع میسّر نہیں آئے۔ انھوں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماحول کو علمی پایا اور ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے ہاتھ میں کتاب و قلم پکڑ لیا۔"
حکیم عبدالحمید کی زندگی سب کے سامنے ہے ہمیشہ ان کے ہاتھ میں کتاب و قلم ہی دیکھے گئے ہیں شاید ہی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہوں اور اگر ایسی مثالیں موجود بھی ہوں گی تو صرف اولیاء اللہ ہی کی مثالیں ہوں گی۔ جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ کیا ایک کاروباری انسان کی زندگی کا آغاز کتاب و قلم سے بھی ہوسکتا ہے تو سخت حیرت ہوتی ہے۔
حکیم عبدالحمید صاحب ایک کاروباری ماحول میں پیدا ہوئے تھے لیکن مالکِ کونین کی طرف سے ایک فطری دل۔ حسّاس طبیعت اور نرم گفتار مزاج کے فرد بنے۔
کاروبار کو وسعت دینے اور جسم انسانی کو مرض سے بچانے کے لئے انھوں نے

۱۹۳۲ء میں ایک رسالہ "ہمدرد صحت" جاری کیا جس کے خاص نمبر جو جولائی میں منظرِ عام پر آتے تھے ہر خاص و عام کی توجہ اور مرضاء وامراض کے بیش بہا خزانے سے پر ہوتے تھے۔ مدیرِ اوّل حکیم خواجہ نیاز احمد جوان کے دستِ راست تھے مقرر ہوئے پھر یہ ادارت کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر ڈال لی۔ بعد اس کے ۱۹۳۷ء سے حکیم محمد سعید برادرِ خورد مدیر مقرر ہوئے جو تقسیم ملک سے قبل تک رہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لئے بند رہا پھر برادرِ خورد حکیم محمد سعید کی مہربانیوں اور کوششوں سے ۱۹۴۸ء سے کراچی سے دوبارہ اجراء ہو جو آج تک مسلسل پابندی وقت سے برابر شائع ہو رہا ہے۔

کاروبار کو وسعت دینے اور دیگر ممالک میں طب و رفتارِ طب کا جائزہ لینے کے لئے انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ ۱۹۵۲ء میں جنوب مشرقی ایشیا کا سفر ایک دیگر رفقاء ڈاکٹر برکات احمد کے ساتھ کیا۔ اس دورے میں مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش۔ رنگون۔ بنکاک انڈونیشیا وغیرہ میں دیسی طبوں کی ترقی کا جائزہ لیا۔ یہ سفر کوئی دو ماہ کے وقفہ کا رہا۔

اس کے بعد ۱۹۵۶ میں قریب ڈھائی ماہ کے طویل عرصہ تک کا ایک سفر یورپ کے مندرجہ ذیل ملکوں کا کیا۔

ترکی انگلستان۔ فرانس۔ اسپین، جرمنی۔ ہالینڈ۔ سوئزرلینڈ وغیرہ کا گھومنے اور سیاحت کرنے کا حکیم عبدالحمید کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا کہ طب اور سائنس کی دنیا میں مغرب نے کس حد تک ترقی اور پیش رفت کی ہے۔ فنِ صدلہ یا دواسازی میں کیا اصلاحی اور انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اربابِ علم و دانش و ادب کسی انداز اور نہج سے کام کر رہے ہیں۔ مذہبی حیثیت کی حامل مقامات کی کیا اہمیت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سفر سے لوٹتے ہی حکیم صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اتنے بڑے وعظیم ادارہ کو ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ یہ خدمت ہی حکیم صاحب کی اتنی بڑی و گراں قدر خدمت تھی کہ حکیم صاحب کا یہی کارنامہ ان کو حیاتِ جاودانی

بخشنے کے لئے کافی تھا۔

مندرجہ بالا اسفار سے حکیم صاحب نے طب کو نئی شکل اور ایک نیا بانکپن عطا کرنے کا عہد کیا۔ تاریخ موجود ہے کہ اتنے بڑے بڑے پروجیکٹ اور پروگرام کسی ایک فردِ واحد کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں اور کسی نے آج تک وہ کام نہ کئے جو اُن کی اکیلی ذاتِ جمیلہ سے ہو گیا ہے۔

۱۔ **ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن:۔**

حکیم صاحب نے اپنے ادارے ہمدرد کی جانب سے انجینیرنگ کی۔ جہاں سے طب ادب اور نمایاں و اعلیٰ تعلیم کے مقاصد کے لئے وظائف دیئے جاتے ہیں۔ یہ ۱۹۶۴ء میں بنا۔

۲۔ **ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم:۔**

جہاں سے ہندوستان کے لا علاج مرضاء کی تجویز و تشخیص اور اسپتال میں بھرتی ہو کر آپریشن و اکیوپنکچر کے ستائے ہوئے مریض علاج کراتے ہیں۔
اس نرسنگ ہوم میں لا تعداد ایم۔ ایس۔ و ایف آر سی ایس ڈاکٹر حکیم صاحب کی ماتحتی میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

۳۔ **غالب اکاڈمی:۔**

جہاں اردو ادب کے تحقیقی اور بنیادی کام انجام دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ **ہمدرد کالج آف فارمیسی:۔**

اس کالج سے جدید تعلیم سے فارمیسی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔

۵۔ **ہمدرد طبّی کالج:۔**

جہاں سے طبّی تعلیم کی ترویج اور اشاعت ہوتی ہے اس کالج کے سند یافتہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگر ممالک تک میں ہیں۔

۶۔ **مجیدیہ گرلس اسکول:۔**

جہاں سے ابتدائی تعلیم سے لے کر اونچے درجات تک کی تعلیم شعبۂ نسواں کے تحت دی جاتی ہے۔

۷۔ **ہمدرد پبلک اسکول:۔** جہاں سے بچے انگریزی ماحول میں پڑھ کر

ملک و قوم کی خدمت کے لئے جاتے ہیں۔

۸۔ مجیدیہ اسپتال :۔ جدید طریقۂ علاج کے لئے بھی حکیم عبدالحمید صاحب نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اسپتال اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

۹۔ ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی :۔
جہاں سے تعلیمی مسائل سے متعلق بیش بہا خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔

۱۰۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز :۔
۱۹۵۷ء میں حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ شعبہ تغلق آباد میں کھولا تھا جو تیس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر اسلامی ادب اور اسلامی مسائل سے متعلق جتنا مواد حکیم صاحب نے فراہم کر دیا ہے شاید پورے خطۂ ایشیاء میں نہیں ہے۔ یہاں پر برابر سیمنار اور سمپوزیم ہوتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ :۔
یہ ادارہ جس کا مخفف آئی۔ ایچ۔ ایم۔ آر۔ ہے۔ اس کی بنیاد اور رسم افتتاح ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ یہ شعبہ اور اس کے کارکنان خصوصاً مسٹر حبیب احمد خاں صاحب بڑی مستعدی سے فن طب اور محققین کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب کے برادر خورد حکیم سعید نے اس خدمت کے بعد حکیم صاحب کو داد تحسین دیتے ہوئے کہا ہے کہ :۔

”ماضی میں اور آج بھی دنیائے اسلام میں بڑے عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں افراط و تفریط کی کم از کم دو جماعتوں نے اپنی راہوں کا تعین کیا ہے۔ ایک جماعت ان علماء کی ہے جو دنیا پرست ہیں اور متعصب اور علم سے بہت دور۔ یہ وہ ارباب مذہب ہیں جو اپنی ہوا پرستی یا تعصب و جہالت سے خود مذہب کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دوسری جماعت وہ ہے جو ان کے مدمقابل ہے اور دائمی تحقیق و اجتہاد فکر ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے علم و حکمت دانشمندی۔ مذہب عقلی

کے نام پر الحاد و انکار کا شور برپا کیا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ مدرسہ میں علم ہے نہ ممبر و محراب میں اخلاق و اخلاص۔ اصحاب صدق و صفا اور اربابِ فکر و نظر الگ کھڑے ہیں۔۔۔

بھائی جان حکیم عبدالحمید کے بارے میں یقین اور دیانتداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شمار اربابِ صدق و صفا میں ہے۔ وہ بے نیازِ دنیا اور نیاز مندِ حق ہیں۔ وہ اپنے بوریائے فقر پر قانع ہیں۔ اور اسی قناعت کے ساتھ علم و حکمت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی جھولی میں حق و صداقت کا بیج ہے جسے انھوں نے تغلق آباد کی سرزمین پر ڈال دیا ہے اور وہ اب اپنی فصل کی کاشت خود کریں گے۔"

آج نئی دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمدرد نگر اراولی پہاڑ کی پُر پیچ وادیوں کو کاٹ چھانٹ کر جس طرح بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے علم و فن و ہنر کا ایک شہر بسا دیا ہے۔

اس ہمدرد نگر میں ایسی ایسی بلند و بالا عمارتیں جس طرح ایک فردِ واحد کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ بقول خواجہ حسن ثانی نظامی۔

"شاہ جہاں نے اپنی آمدنی کا جتنا حصہ عمارتیں بنانے میں صرف کیا ہوگا حکیم صاحب نے اس سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ مگر حکیم صاحب نہ تو کسی ملک کے مطلق العنان بادشاہ ہیں کہ رعایا کی کمائی بے حساب آئے اور بے حساب خرچ کی جائے اور نہ انھیں اس طرح کا ذوق ہے کہ محل قلعے اور مقبرے بنواتے پھریں تاہم انھوں نے اپنی محنت کی اور حق حلال کی کمائی کو عمارتیں بنوانے میں بیدریغ خرچ کیا ہے۔ نئے زمانے کی دلّی میں کسی فرد کو شاہ جہاں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے تو وہ حکیم صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

اعزازات:۔

حکیم عبدالحمید صاحب نے سب کچھ قوم اور ملک و ملّت کے لئے کیا ہے۔

اپنے لئے کچھ نہیں رکھا۔ اور کہا۔
بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ موجودہ ہمدرد دوا خانے کا لائیسنس بھی حکیم صاحب نے دوسروں کے نام بنوا دیا ہے۔
حکیم صاحب اب زندگی کے اس موڑ پر جا پہنچے ہیں۔ جہاں نہ تو صلہ کی تمنا ہے اور نہ ہی ستائش کی پرواہ ہے۔
وہ ہندوستان کی متعدد انجمنوں۔ تعلیم گاہوں۔ سماجی۔ ثقافتی طبیٔ اور ادبی سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے صدر، چیرمین اور ممبر ہیں۔
اپنی ان تعلیمی و طبی خدمات کے عوض حکومت ہند نے ان کو ۱۹۶۵ء میں پدم شری جیسے خطاب اور اعزاز سے نوازا۔ اور یہی نہیں۔ ممالکِ غیر تک نے ان کو ابن سینا جیسے اعزاز و خطاب سے ۱۹۸۳ء میں دنیا کی عظیم حکومت روس نے سرفراز کیا۔

تصانیف :-

آپ اتنے مصروف بلند حوصلہ۔ شفیق۔ سادہ مزاج اور سب سے بڑھ کر بلند اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ کہ وقت کے یہ تابع نہیں بلکہ وقت ان کا غلام ہے۔
ہر بڑے طبیب کی طرح انھوں نے بھی طب کی بہت سی کتب شائع کرائی ہیں جن میں
ہمدرد مطب۔ ہمدرد عطار قرابادین ہمدرد۔
اور اپنے والد ماجد کے مرکبات مجربات کے مجموعہ کو قرابا دین مجیدی کے نام سے طبع کرایا ہے۔ نام و نمود سے بچنے کی خاطر ان کتب میں سے کسی پر بحیثیتِ مصنف۔ مؤلف۔ مرتب یہاں تک کہ ناشر کی حیثیت سے بھی اپنا نام نہیں ڈالا ہے۔
حکیم عبدالحمید صاحب حقیقتاً بڑے آدمی ہیں۔ ان میں وہ تمام تر خوبیاں موجود ہیں جو ایک بڑے فنکار یا بڑے ادیب یا فصیح و بلیغ فرد میں ہوتی ہیں۔

حکیم سیّد علی کوثر چاندپوری

۱۹۰۸ء طبی اور ادبی ادب کا نقیب

ایسی شخصیت کا نام ہے جو طبی اور ادبی حلقوں میں یکساں مشہور ہے اردو جاننے والا اور ادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی باذوق شخص اس نام سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ خداداد صلاحیتوں کے مالک برِصغیر ہند و پاک کے چوٹی کے طبیب اور صفِ اوّل کے ادیب و افسانہ نگاروں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔

حکیم صاحب کا پورا نام سیّد علی کوثر ہے اور ادبی نام کوثر چاندپوری۔

پیدائش :۔

آپ کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں یوپی کے ضلع بجنور کے قصبہ چاندپور میں ہوئی آپ کے والد حکیم سیّد علی مظفر صاحب خود بھی پایہ کے حکیم تھے اور ضلع بجنور کے علمی اور طبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور نظم و نثر سے دلچسپی رکھتے تھے۔

تعلیم و تربیت :۔

حکیم کوثر صاحب کی پرورش بھی اس کی نگہداشت میں ہوئی۔ جو خصوصیات ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کو انھوں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور صلاحیتوں سے جلا دیکر ملک گیر شہرت حاصل کی۔ والد سے اردو فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم
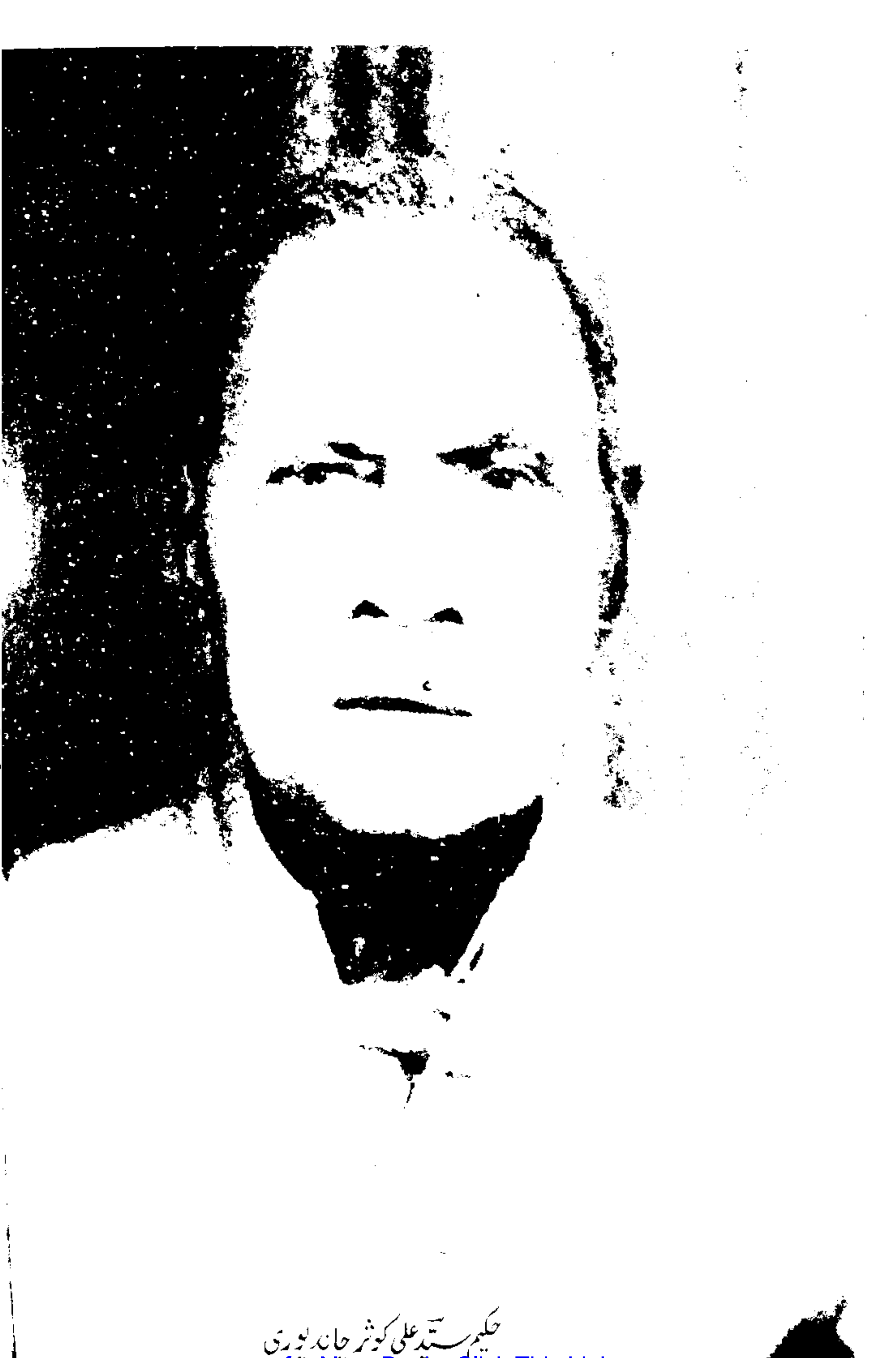
حکیم سید علی کوثر چاند پوری

حاصل کرکے ۱۹۱۷ء میں ریاستِ بھوپال کے آصفیہ طبّیہ اسکول (جو بعد میں آصفیہ طبّیہ کالج کہلایا) میں داخلہ حاصل کرکے باقاعدہ طبِ یونانی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ یہاں کا ماحول کوثر صاحب کی طبّی اور ادبی تربیت کے لئے نہایت سازگار رہا۔ طبّی اسکول میں ہر ہفتہ کو مجلس مذاکرہ کا انعقاد ہوتا تھا جس میں کوثر صاحب نے باقاعدہ حصّہ لینا شروع کیا اور طبّی مضامین پیش کرنا شروع کئے۔ اور رفتہ رفتہ اس عادت نے عادتِ ثانیہ کا رُخ اختیار کرلیا۔ اور ان کی تحریروں میں نکھار آتا رہا۔ اور دورانِ تعلیم ہی ان کے مضامین الحکیم لاہور۔ جامع الطبا، لکھنؤ۔ اور مصباح الحکمت سہارنپور میں باقاعدگی سے شائع ہونا شروع ہو گئے اور ایک طبّی کتاب "الدق" کے نام سے اسی زمانے میں شائع ہوئی۔ اس کی ایک جلد اب بھی جامعہ ملیۂ اسلامیہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ ان تمام مشاغل کے باوجود حکیم صاحب اپنی طبّی تعلیم کی جانب یکسوئی سے توجّہ دیتے رہے اور امتیازی کامیابی بھی ۱۹۲۲ء میں طبّی تعلیم امتیاز کے ساتھ اور سرجری و میڈیسن میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرکے نقرئی تمغہ کے ساتھ مکمل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد ہی حکیم کوثر صاحب کا تقرر بحیثیت طبیب محکمۂ صحت بھوپال کے زیرِ اثر تحصیل سلوانی کے یونانی شفاخانہ میں ہوگیا اور اس کے بعد قصبہ بیگم گنج۔ رائسین نیز دیگر مقامات پر نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ ان تمام علاقوں میں حکیم صاحب اپنی طبّی صلاحیت اور ادبی ذوق کے باعث نہایت مشہور اور ہر دلعزیز ہو گئے۔ ان کا نام اس وقت ادبی اور طبّی دنیا میں اجنبی نہیں رہا تھا اور ادبی دنیا میں وہ صفِ اوّل میں شامل ہو چکے تھے۔ بحیثیت ملازم کوثر صاحب کا آخری تقرر بھوپال میں رابعہ اسپتال سے ۱۹۵۸ء میں وہ بحیثیت افسر الاطبا ریٹائرڈ ہوئے۔ کوثر صاحب طبّی، ادبی اور سماجی حلقوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز رہے۔ بھوپال کے اطبّاء اور ادیب و شعراء ان کو اپنا بزرگ اور قائد تصوّر کرتے تھے اور وہ بھوپال ہی نہیں بلکہ مدھیہ پردیش میں طبِ یونانی کے ارتقاء اور اردو زبان کی بقا و ترقی کی مہم کے سپہ سالار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۴ء میں بھوپال چھوڑنے تک وہ مسلسل بلا مقابلہ اتّفاق رائے سے مدھیہ پردیش یونانی طبّی کانفرنس اور مدھیہ پردیش انجمن ترقّی اردو کے صدر رہے۔ اپنے قیام

بھوپال کے دوران کوثر صاحب کی ذات اور شخصیت وہاں کی ادبی اور طبی زندگی کی جان تھی اور وہ ان حلقوں کے بے تاج بادشاہ تصور کئے جاتے تھے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد کوثر صاحب بھوپال میں ہی اپنا ذاتی مطب نہایت کامیابی سے کرتے رہے جب ۱۹۶۴ میں حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمدرد نرسنگ ہوم اینڈ ریسرچ کلینک دہلی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے ساتھ یونانی طب کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی نظر انتخاب حکیم کوثر صاحب پر ٹھہری۔ حکیم عبدالحمید صاحب سے حکیم کوثر صاحب کے ذاتی اور دیرینہ تعلقات تھے اور انھوں نے اس عہدے کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ لیکن حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ لکھ کر کہ فنِ طب کو آپ کی ضرورت ہے" کوثر صاحب کو خاموش کر دیا۔ اور انھوں نے ہمدرد نرسنگ ہوم دہلی میں بحیثیت میڈیکل آفیسر یونانی اپنا عہدہ سنبھال لیا اور تقریباً ۱۸ سال اس سے وابستہ رہے۔ اس دوران حکیم صاحب اپنی طبی صلاحیتوں اور نباضی کی بنا پر بہت مشہور ہوئے جس کا اندازہ مریضوں کی بھیڑ سے لگایا جا سکتا تھا۔ گردہ کی پتھری ایگزیما اور برص کے علاج کے لئے حکیم کوثر صاحب خصوصی طور پر مشہور رہیں۔ دہلی کے مشہور سرجن اور ہمدرد نرسنگ ہوم کے چیف سرجن ڈاکٹر آر این کٹاریہ تو ان کی پتھری کے علاج سے اس قدر متاثر تھے کہ اکثر انھوں نے کئی مریض آپریشن کرنے کے بجائے حکیم کوثر صاحب کے پاس بھیجے۔ اور ان کا ہر علاج کامیاب رہا۔ ایگزیما کی ایک مریضہ جو ہندوستانی افواج کے ایک کور کمانڈر جنرل لکھونت سنگھ کی بہن اور جن کے دونوں پیر نیچے سے اوپر تک اس مرض کا شکار تھے اور وہ مکمل مایوسی کی حالت میں تھیں۔

حکیم صاحب نے جونکوں کی مدد سے ان کا کامیاب علاج کیا تھا۔

اسی دوران حکیم صاحب یونین پبلک سروس کمیشن میں طبیب حضرات کے انٹرویوز کی پینل میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور کونسل آف ریسرچ یونانی میڈیسن کی کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور اس کے اجلاسوں میں حیدرآباد مدراس وغیرہ میں شرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۸۲ء میں ہمدرد نرسنگ ہوم کے تغلق آباد میں

منتقل ہو جانے پر حکیم صاحب نے بعد میں ذاتی طور سے سبکدوش ہو کر گھر پر ہی مریضوں کو مشورہ دینے کا سلسلہ شروع کیا جو ہنوز جاری ہے۔

اپنی ان تمام فنی مصروفیات کے باوجود حکیم صاحب نے تحریر و تخلیق و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی طبی تصانیف گہرے مطالعہ تجربہ اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ وہ جس طرح ان پر محنت سے کام کرتے ہیں اس کا اعتراف حکیم عبدالحمید صاحب نے کوثر صاحب کی تصنیف "اطبائے عہدِ مغلیہ" میں اس طرح کیا ہے۔

"تمام کتب تاریخ میں سے طبی مواد کا نکالنا آسان کام نہیں۔ یہ کام وہی شخص بہتر طور پر کر سکتا ہے جو بیک وقت طبیب بھی ہو اور تاریخ کا صحیح ذوق بھی رکھتا ہو اور پھر حاصل شدہ مواد کو دلکش انداز میں پیش کرنے کے لئے ادیب بھی ہو۔ کوثر چاندپوری کی ذات میں یہ صفات ایک خاص امتزاج سے جمع ہیں۔"

حکیم صاحب کی طبی صلاحیتوں سے ہر مکتبِ خیال کے لوگوں نے استفادہ حاصل کیا اور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اردو کے مشہور شاعر رام کرشن مضطر صاحب بھی حکیم صاحب کے مداح تھے اور ان کی طبی صلاحیتوں سے بے حد متاثر انھوں نے حکیم صاحب کو منظوم خراجِ تحسین اس طرح پیش کیا ہے۔

طبیب نیک سرشت و ادیب نکتہ نواز — ہر انجمن میں ہیں جو سربلند و سرفراز
حکیم کامل و عیسیٰ نفس علی کوثر — شعورِ طب قدیم و جدید کے مظہر
وہ خوئے لطف کہ بیتاب دل سکوں پائے — وہ نرم لہجہ کہ بیمار کو قرار آئے
وہ جن کے سایہ میں ملتا ہے ہر دکھی کو چین — وہ جن کا خدمتِ انسانیت ہے نصب العین

حکیم کوثر صاحب کے طبی اور ادبی معرکوں اور تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو شاید یہ خود ایک ضخیم کتاب کی شکل میں جمع ہو۔

وہ جسمانی مرضوں کا علاج اپنے نسخوں کے ذریعہ اور سماجی برائیوں کا علاج و مداوا اپنے ادبی شاہ پاروں سے جس طرح کرتے ہیں اس سے ہر آدمی متاثر ہوتا ہے۔ اور دونوں میدانوں میں ان کی مہارت اور شہرت قابلِ رشک بات ہے۔ ان کی ہمہ رنگ شخصیت کو مشہور ناقد ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرحوم اس طرح

خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"لفظ حکیم اپنے مروجہ مفہوم کے ساتھ کوثر چاندپوری کی قبائے شخصیت پر اتنا تنگ ہے کہ باوجود اپنی نمایاں قدر خصوصیات کے پوری طرح ان کے جوہرِ حکمت کو سامنے نہیں آنے دیتا"

(ٹائٹل کور دانش و بینش مصنف کوثر چاندپوری)

حکیم صاحب کی طبی تصانیف میں سینکڑوں شائع شدہ طبی مضامین کے علاوہ "اطبائے عہد مغلیہ" "الدق" "حکیم اجمل خاں۔ طبِ قدیم میں جدید علوم کی آمیزش اور موجز القانون شامل ہیں۔ آخرالذکر نصابِ تعلیم میں شامل ہے۔

آپ کا شمار برِصغیر ہندو پاک کے چوٹی کے طبیبوں اور صفِ اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ان کو ادبی طبی اور ثقافتی حلقوں میں یکساں مقبولیت و شہرت حاصل ہے۔

یہ فیصلہ کرنا از حد مشکل ہے کہ ان کا طبی سرمایہ زیادہ ہے یا ادبی۔ بہرحال یقیناً یہ طب یونانی کی خوش قسمتی اور اردو ادب کی نیک بختی ہے کہ اس کو کوثر صاحب کی ملکیت حاصل ہے۔ چاہے ادب کا ذکر ہو یا طب کا۔ حکیم صاحب کی شخصیت پر دونوں پہلوؤں سے نظر ڈالے بغیر یہ کام پورا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ انھوں نے اپنے قلم سے بہترین افسانوی ادب کی تخلیق کی ہے۔ برصغیر ہندو پاک کا کوئی معیاری جریدہ ایسا نہیں جس میں کوثر چاندپوری کی شمولیت قابلِ فخر نہ سمجھی جاتی ہو۔ بلاشبہ ہزاروں افسانے کوثر صاحب کے قلم سے جنم لے چکے ہیں اور ان کی بیشتر کہانیاں لافانی مقام کی مالک ہیں۔ کوثر صاحب نے صرف افسانے ہی نہیں بلکہ ناول تحقیقی و تنقیدی کتب رپورتاژ اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کی شخصیت اردو ادب میں قابلِ تعظیم و احترام ہے۔

مشہور طنز نگار فکر تونسوی مرحوم کوثر صاحب سے تحریری انٹرویو (" ماہنامہ شاعر کوثر چاندپوری ") میں فرماتے ہیں۔

"آپ ہمیشہ مجھے قابلِ تعظیم ہی لگتے ہیں۔ آپ کا جب بھی تصور آتا تو آپ کے ساتھ منشی پریم چند کا تصور بھی آجاتا۔ اسکو میری عقیدت سمجھئے۔ میں آپ کو ہمیشہ

پریم چند سے ایسوسی ایٹ کرتا۔ جب میں آپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں تو شرمندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ کا تو صرف احترام ہی کیا جا سکتا ہے۔"

کوثر صاحب ایک اچھے نبّاض اور معالج ہیں۔ اپنے مریضوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان کے مرض کو پہچان کر اس کا علاج کرتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ اپنے تیکھے نشتروں سے سماجی ناسوروں کو چیرتے ہیں۔ سماج میں رہنے والوں کے زخموں کا اندازہ کرکے اپنے دل سے ان کی نباضی اور قلم سے ان کا علاج کرتے ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول اس کے مظہر ہیں۔ جنھیں انھوں نے بیشتر سماج کی بُرائیوں کو سامنے رکھ کر تصنیف کئے ہیں۔ ان کے افسانے دلوں پر اَنمِٹ نقوش چھوڑتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی بات کو دل کی نظر سے دیکھ کر قلم کی زبان عطا کر دیتے ہیں۔

مشہور ادیب حیات اللہ انصاری فرماتے ہیں۔

"کوثر کے اسلوب میں پریم چند کی جھلک ہے عمومی بات میں گہرائی دیکھ لینا۔ ناقابلِ توجہ حرکتوں میں افسانہ پیدا کر لینا اور بڑی کہانیوں کو اختصار میں سمیٹ لینا ان ہی قلم کاریوں کی وجہ سے کوثر کی بعض کہانیاں دماغ میں عرصہ تک گونجا کرتی ہیں"

(رات کا سورج مصنفہ کوثر چاند پوری)

کوثر صاحب کے افسانوں کے کردار ہمارے لئے نئے نہیں۔ وہ ہمارے اردگرد کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں میں تصنع یا بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے افسانے حقیقت سے قریب لگتے ہیں بعض افسا ان میں ہم کو ہماری روزمرہ کی زندگی کا احساس رہتا ہے۔ اردو کے نقاد وقار عظیم نے اپنی کتاب "داستان سے افسانے تک" میں کوثر چاند پوری کے افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں اور فن کی رعنائیوں کا اعتراف کیا ہے۔ اور جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو معراج عطا کی اُن میں کوثر صاحب کو بھی شامل کیا ہے۔

کوثر صاحب نے طب یونانی اور اردو ادب کی انتھک اور خاموش خدمت کی ہے وہ کسی گروہ یا گروپ بندی کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی صلہ ستائش

یا اعزاز کی خواہش کی۔ اس کے باوجود بھی ان کو مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اب تک شاید کوئی بھی اعزاز یا انعام ان کی بلند پایہ شخصیت کے قابل نہیں ہے۔

ڈاکٹر مجاہد حسینی صدر شعبۂ اردو و فارسی ایم ڈی کالج پریل بمبئی۔ کوثر صاحب کی فن اور شخصیت پر ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں۔ اور بھوپال میں شفیق اعجاز نے ایم اے کے لئے اپنے تحقیقی مقالے کوثر چاندپوری فن اور شخصیت کو وسعت دیکر اس پر ڈاکٹر آف فلاسفی (P.H.D) کے لئے کام کر رہے ہیں۔

کوثر صاحب کا شمار اردو کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب (جو ہمارے محترم و مقتدر نقاد ہمیشہ شمار کئے جاتے ہیں) نے اپنے عکس اور آئینہ میں اردو افسانے کا سربلند کرنے والے جن ۲۱ افسانہ نگاروں کو نامزد کیا ہے ان میں کوثر چاندپوری بھی شامل ہیں۔

کوثر صاحب کی تاریخی تصنیف "بیرم خان ترکمان" ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے حوالے سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مطبوعہ لندن میں ابوسعید بزمی ایم اے کا مقالہ شائع ہوا ہے۔ اور اسی کتاب کا حوالہ ایک روسی کتاب مصنفہ غضنفر علی یوف میں دیا گیا ہے جس میں کتاب کے اقتباسات فارسی رسم الخط میں دیئے گئے ہیں۔

کوثر صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے تھکے نہیں ان کا قلم ابھی بھی رواں دواں ہے وہ ۸۰ اسّی سال کی عمر میں بھی اسی انہماک سے اپنے مریضوں کو دیکھتے اور اسی ذوق و شوق و جستجو سے ادبی تخلیق کرتے ہیں اور آج بھی صفِ اول میں اپنے مقام پر فائز ہیں۔ مشہور پاکستانی ادیب انور سدید رقمطراز ہیں:۔

"آج کے بہت سے ادیب جب پالنے میں انگوٹھا چوس رہے تھے کوثر چاندپوری شہرت کے نصف آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ کچھ کئی نامور افسانہ نگار ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی شہرت کا بوجھ نہ سہار سکے اور آج اتنے گمنام ہو گئے ہیں کہ ان کا نام افسانہ نگاروں کی طویل فہرست میں بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن کوثر چاندپوری کا قلم نہ صرف

رواں دواں ہے بلکہ ان سے آس رہتی ہے جس کا تذکرہ دل نکل کر لبوں تک بھی آجاتا ہے۔"

(رسالہ اوراق اپریل ۱۹۷۵ء تبصرہ آوازوں کی صلیب مصنفہ کوثر چاندپوری)

انور سدید کا یہ تبصرہ آج بھی کوثر صاحب کے لئے بالکل موزوں ہے۔ ان کا قلم آج بھی اسی طرح جوان ہے اور اپنے سفر پر گامزن ہے۔

وہ طب یونانی اور اردو ادب کی قابلِ قدر اور قابلِ احترام میراث ہیں۔

۱۶ دسمبر ۸۶ء کو اردو اکاڈمی دہلی نے کوثر صاحب کے اعزاز میں ایک شام منعقد کی۔ انور علی دہلوی نے صدارت کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے۔

"کوثر صاحب نہ چاندپوری ہیں۔ نہ بھوپالی۔ نہ دہلوی۔ وہ ایک ملک گیر شخصیت ہیں۔"

اعزازات:۔

(۱) میونسپل بورڈ مدھیہ پردیش کا ادبی اعزاز ۱۹۶۲ء۔

(۲) اردو اکاڈمی یوپی کا مختلف کتابوں پر انعامات۔
۱۹۷۷ء۔ ۱۹۷۴ء۔ ۱۹۷۳ء۔

(۳) اردو اکاڈمی مدھیہ پردیش ایوارڈ ۱۹۸۱ء۔

(۴) میر ایوارڈ۔ میر اکاڈمی۔ لکھنؤ۔

حکیم کوثر چاندپوری کی چند مطبوعہ تصانیف:۔

نمبر	فن	نام کتاب	ناشر	سن اشاعت
۱۔	ناول	ویرانہ	انوار احمد پریس الہ آباد	۱۹۴۴ء
۲۔	"	داستانیں (باغ و بہار جدید افسانوی لباس میں)	"	۱۹۵۵ء
۳۔	"	پیاسی جوانی	نیوتاج آفس دلی	"
۴۔	"	ہنی مون	-	-

۵۔	؍؍ اغوا۔	مکتبہ جہانستان دلی	۔
۶۔	؍؍ سب کی بیوی۔	چندن بکڈپو دلی	۔
۷۔	؍؍ توڑ دو زنجیریں۔	بھنکا بکڈپو علی گڑھ	۔
۸۔	؍؍ راکھ اور کلیاں (دوسرا ایڈیشن)	ناولستان گاندھی نگر	۱۹۸۱ء
۹۔	؍؍ فریدہ موہنی کی ڈائری (فینٹسی)	مکتبہ بیسویں صدی دلی	۱۹۶۴ء
۱۰۔	؍؍ شام غزل۔	مشورہ بکڈپو نئی دلی	۱۹۶۴ء
۱۱۔	؍؍ مسکراتی زندگی۔	؍؍ ؍؍	—
۱۲۔	؍؍ عشق نہ دیکھے۔	اسٹار پبلکیشنز دلی۔	۱۹۶۵ء
۱۳۔	؍؍ محبت اور سلطنت۔	مکتبہ کائنات لاہور۔	۱۹۶۲ء
۱۴۔	؍؍ مرجھائی کلیاں۔	مجلس اشاعت ادب دلی۔	۱۹۶۲ء
۱۵۔	؍؍ پتھر کا گلاب۔	حلقۂ فکر و شعور دلی۔	۱۹۶۸ء
۱۶۔	؍؍ گونگا ہے بھگوان۔	مکتبہ جامعہ۔	۱۹۷۲ء
۱۷۔	؍؍ مہکتی بہاریں۔	—	—
۱۸۔	افسانوی مجموعے دلگداز افسانے۔	مکتبہ جدید لاہور۔	۱۹۲۹ء
۱۹۔	؍؍ دنیا کی حور۔	آسی پریس لکھنؤ۔	۱۹۳۰ء
۲۰۔	؍؍ ماہ و انجم۔	عالمگیر بکڈپو لاہور۔	۱۹۳۷ء
۲۱۔	؍؍ دلچسپ افسانے۔	جامعہ پریس دہلی	۱۹۳۸ء
۲۲۔	؍؍ رات کا سورج۔	۱۲۲۱ بلیماران دہلی	۱۹۷۶ء
۲۳۔	؍؍ دنیا کی حور اور دوسرے افسانے۔	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۳۸ء
۲۴۔	؍؍ گل و لالہ۔	انوار احمدی پریس الہ آباد	—
۲۵۔	؍؍ شب مالع	؍؍ ؍؍	۱۹۴۱ء
۲۶۔	؍؍ عورتوں کے افسانے	مکتبہ جدید لاہور۔	—
۲۷۔	؍؍ رنگین سپنے۔	نفیس بکڈپو حیدرآباد۔	—
۲۸۔	؍؍ لیل و نہار (فسانۂ عجائب جدید افسانوی لباس میں))	انوار احمدی پریس الہ آباد۔	۱۹۴۴ء

۲۹۔ 〃 اشک و شرر۔	دارالبلاغ لاہور	۱۹۴۴ء
۳۰۔ 〃 شعلۂ سنگ۔	ہمدرد اکیڈمی کراچی	۱۹۶۳ء
۳۱۔ 〃 آوازوں کی صلیب۔	حلقۂ فکر و شعور دلی	۱۹۷۳ء
۳۲۔ تحقیق و تنقید۔ دیدۂ بینا۔	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔	۱۹۶۸ء
۳۳۔ 〃 جہان غالب۔	مکتبۂ کائنات لاہور	۱۹۶۵ء
۳۴۔ 〃 〃 〃 (ہندوستانی ایڈیشن)	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔	۱۹۶۸ء
۳۵۔ 〃 فکر و شعور۔	مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی۔	۱۹۸۱ء
۳۶۔ 〃 دانش بینش۔	حلقۂ فکر و شعور بلیماران دہلی۔	
۳۷۔ (انشائیہ) کوثرستان۔	انوار احمدی پریس الٰہ آباد	۱۹۴۵ء
۳۸۔ رپورتاژ۔ کارواں ہمارا۔	حلقۂ فکر و شعور دلی۔	۱۹۶۶ء
۳۹۔ تاریخ بیرم خاں ترکمان۔	آگرہ پریس آگرہ۔	۱۹۳۱ء
۴۰۔ 〃 اطبائے عہدِ مغلیہ۔	ہمدرد اکاڈمی کراچی۔	۱۹۶۰ء
۴۱۔ 〃 حکیم اجمل خان۔	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔	۱۹۷۴ء
۴۲۔ (طنز و مزاح) مسکراہٹیں۔	مشہور بکڈپو دلی۔	۱۹۳۷ء
۴۳۔ 〃 موج کوثر۔	〃 〃	۱۹۳۸ء
۴۴۔ 〃 شیخ جی۔	لاجپت رائے بکڈپو لاہور۔	۱۹۳۹ء
۴۵۔ 〃 نونک جھونک۔	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد۔	۱۹۴۰ء
۴۶۔ 〃 خندۂ دل۔	انوار احمدی پریس الٰہ آباد۔	۱۹۴۲ء
۴۷۔ (الف) بچوں کے لئے (ب) حالی سرسید۔	الٰہ آباد۔	
۴۸۔ سیاح لڑکا کولمبس	〃	
۴۹۔ استقلال۔	انوار احمدی پریس الٰہ آباد۔	
۵۰۔ رشوت۔	〃 〃 〃	
۵۱۔ بادلوں کی ملکہ۔	〃 〃 〃	
۵۲۔ بہادر لڑکا۔	〃 〃 〃	
۵۳۔ چوبیا بیگم۔	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد۔	

۵۴۔ چالاک مُرغا۔
۵۵۔ لڑکے کا خواب۔
۵۶۔ ہونہار لڑکا۔
۵۷۔ غرور کا انجام۔
۵۸۔ موتیوں کا انڈا۔
۵۹۔ چوہوں کی بستی۔
۶۰۔ جادو کا خزانہ۔
۶۱۔ (الف) کبڑا جادوگر۔
۶۲۔ خوب صورت محل۔
۶۳۔ وفادار دوست۔
۶۴۔ (طب) موجز القانون۔ ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۸۳ء
۶۵۔ " محسنِ اطفال۔
۶۶۔ " الدق۔
۶۷۔ " دستور العمل۔
۶۸۔ " المباحثہ۔ العلائیہ۔
۶۹۔ " قدحِ کبیری۔
۷۰۔ " رسالہ آتشک۔
۷۱۔ طب قدیم میں جدید علوم کی آمیزش۔ حلقۂ فکر و شعور بلیماران دہلی وغیرہ وغیرہ۔
۷۲۔ دغاباز دوست۔
۷۳۔ سمندر کا شہزادہ۔
۷۴۔ علم و تجارت۔

حکیم شکیل احمد شمسی

۱۹۱۴ء — ۱۹۵۸ء

طبّی سیاست کے ترجمان

دہلی ولکھنؤ جس طرح شعروادب۔ تہذیب وتمدن۔ تاریخی حیثیت سے جُداگانہ اہمیت کے حامل ہیں اسی طرح دونوں مقام کے عوام کے خیالات۔ احساسات واطبّاء کے طریقۂ علاج بھی جدا جدا ہیں۔ دہلی جو شان وشوکت کا بانکپن لئے اگر مرکبات کا شیدائی ہے تو لکھنؤ میں علاج بالمفردات کے طریقہ کا چلن ہے۔ دہلی میں طریقۂ علاج کے میدان میں اگر خاندانِ شریفی کو ملکہ حاصل ہے تو لکھنؤ میں خاندانِ عزیزی کی حکمرانی ہے۔ ان مراکز میں کسی غیر طبّی خاندان یا فردِ واحد کو کامیابی ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

سرزمینِ ہند جو ہمیشہ سے گہوارۂ امن اور صوفی سنتوں وبزرگانِ دین کا مرکز ومسکن رہی ہے۔ ان صوفی سنتوں وبزرگوں نے اپنے اوصافِ حمیدہ سے وہ قابلِ ذکر کارنامے انجام دیئے ہیں جو تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں۔ ایسے ہی ایک بزرگ شمس تبریزؒ تھے۔ جن سے شمسی طبقہ (پنجابی) اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔

قوم پنجابی میں فرقہ کھتری کے اجداد کسی دریا میں نہانے جا رہے تھے اُدھر سے شمس تبریزؒ جو دعوتِ تبلیغِ اسلام میں منہمک تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اگر اس قوم کی اصلاح کر دی جائے اور یہ قوم بامشرفِ اسلام ہو جائے تو خطۂ پنجاب میں دینِ اسلام کی کرنیں بکھر جائیں گی۔

شمس تبریزؒ نے سردارِ قوم سے کہا کہ اگر وہ ندی جس میں تم نہانے جا رہے ہو

حکیم شکیل احمد شمسی صاحب مرحوم

یہیں بلا دیں تو گویا قبولِ اسلام کر دگے۔ کھتری قوم کے پیشوا راضی ہو گئے۔ شمس تبریزؒ نے کہا کہ آنکھ بند کرو۔ ان کے ایسا کرتے ہی شمس تبریزؒ نے خدا سے دعا کی اور مرضیٔ خدا وہ ندی ان کے پاس اور اُن کے سامنے آ گئی۔

اس طرح یہ قوم دامنِ اسلام کے آغوش میں آ گئی۔ حکیم شکیل احمد شمسی کے اجداد اسی نومسلم خاندان سے متعلق تھے۔ شمس تبریزؒ جو ایک عالم باعمل صوفی باوصف اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ان کے جاہ وجلال علم وفضل اور کرامات کے بہت سے واقعات مشہور ہیں جن میں مندرجہ ذیل واقعہ کی تاریخی اور علمی حیثیت اظہر من الشمس ہے۔

مشہور بزرگ اور ولیٔ کامل وصادق مولانا جلال الدین رومیؒ دریائے دجلہ کے کنارے ایک مقام پر تصنیف وتالیف۔ غور وفکر اور خیالاتِ تصوف میں غلطاں و پیچاں بیٹھے تھے کہ ناگاہ نظر کا ٹکراؤ ہوا اور اللہ والے ایک دوسرے کو پہچان گئے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ سے شمس تبریزؒ مخاطب ہوئے اور کہا ایسا بھی علم کیا اور عالم کیا جو کتابوں کا محتاج ہو۔ اور مولانا جلال الدین رومی کے ارد گرد پھیلی ہوئی کتب کو جو ایک ذخیرہ کی شکل میں تھیں۔ بیک جنبش غرقِ دریا کر دیا۔ مولانا جلال الدین از حد فکر مند اور متحیر تھے کہ سارا علم وذخیرہ دریا کی نظر ہو گیا۔ یہی کل کائنات اور اثاثۂ زندگی تھا۔ مولانا کی اضطراری کیفیت اور پریشانی کو دیکھتے ہوئے حضرت شمس تبریزؒ نے دریائے دجلہ میں ہاتھ ڈالا اور غرق شدہ کتب مولانا کی خدمت میں حسبِ سابق پیش کر دیں۔

تب یہ شعر نذر کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمسِ تبریزی نہ شد

خاندان:۔

حکیم شکیل احمد شمسی کے اجداد ہند و پاک پر مشتمل پنجاب کے کچھ اضلاع میں مقیم

ایک غیر مسلم طبقہ پر مشتمل تھے۔ یہ طبقہ نومسلمین میں شمار ہوتا تھا اور حضرت شمسؒ تبریزی کے ہاتھوں مشرف با اسلام ہوا۔ تاریخی واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس طبقہ کے افراد حسب معمول کسی ندی میں نہانے جارہے تھے۔ راستہ میں شمس تبریزؒ نے ان کو دعوت اسلام دی اور کہا اگر گنگا یا ندی اسی مقام پر منگا دیں تو کیا قبول اسلام یہ طبقہ کرے گا۔ شمس تبریزؒ جن سے اس کے قبل حیران کن واقعات ظہور میں آچکے تھے۔ انھوں نے وعدہ کے بموجب وہ ندی اُسی مقام پر پلک جھپکتے ہی جاری وساری کردی۔ ان نومسلمین نے حضرت شمس تبریزؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

پیدائش :-

شکیل احمد یو پی کی مشہور ریاست رام پور کے محلہ گھیر مردان خاں کے ایک تاجر گھرانہ میں ۲۰ر جولائی ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حاجی حبیب احمد حسب دستور پیشۂ تجارت سے منسلک تھے۔ ان کے نانا مولوی منور علی محدث کا شمار مشہور علماء میں ہوتا تھا۔

تعلیم و تربیت :-

بچپن کے ابتدائی اسباق اپنے نانا منوّر علی سے حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کی تکمیل مدرسہ عالیہ رام پور (جو رام پور میں ایک نمایاں و قدیم مرکز علم و ادب ہے) سے کی۔ بعد فراغت مدرسہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرکے حصول طب کے لئے لکھنؤ کا سفر کیا۔ اور طب کی مشہور طبی درس گاہ تکمیل الطب طبیہ کالج میں عوام الناس کی خدمت کرنے کے لئے طب کی تعلیم میں داخلہ لیا۔ ایسے وقت میں سرزمینِ لکھنؤ پر خاندانِ عزیزی کے روشن ستاروں شفاء الملک حکیم عبدالحمید شفاء الملک حکیم عبدالمعید۔ شفاء الملک حکیم عبدالحسیب کا ڈنکا بج رہا تھا۔ شکیل احمد شمسی نے مذکورہ بالا صاحب علم و ادب سے نہ صرف فیضان حاصل کیا بلکہ تکمیل الطب کالج کے ماہرفن اساتذہ سے استفادہ حاصل کیا۔ شکیل احمد شمسی کا طالب علمی کا زمانہ لکھنؤ کا بہترین طبی زمانہ تھا۔ آپ نے نہ صرف طب کی تعلیم حاصل کی

بلکہ لکھنؤ کی علمی و ادبی صحبتوں سے فیضیاب ہوکر شعر و ادب کی جانب بھی مائل ہوئے اور اس شوق کو جلا حاصل ہوئی۔ تکمیل الطب کالج سے طبیب ماہر اور انڈین میڈیسن بورڈ سے ڈی۔ آئی۔ ایم ایس کی اسناد حاصل کیں۔ آپ کا شمار تکمیل الطب کالج کے قابلِ فخر فرزندوں میں ہوتا تھا۔ تکمیل الطب کالج سے فراغت کے بعد ۱۹۲۲ء میں اپنے آبائی وطن رام پور میں خدمت کی غرض و غائت سے مطب و دواخانہ قائم کیا۔ ۱۹۴۲ء میں اپنے استاد محترم اور مربی شفاء الملک حکیم عبد المعید کی دعوت پر مادرِ علمی طب تکمیل الطب طبیہ کالج میں بحیثیت استاد کے مقرر ہوئے۔ کالج میں آپ کے لئے کوئی مخصوص مضمون درس کے لئے نہ تھا۔ آپ کو جو بھی مضمون پڑھانے کے لئے دیا جاتا تھا آپ نے اس کو بحسن و خوبی پڑھایا۔ آپ کے پڑھائے ہوئے اسباق کو طلباء تکمیل الطب کالج۔ طبیہ کالج دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ آپ نے اس کالج میں علمِ تشریح۔ تو کبھی علمِ کیمیا۔ کبھی علم الولادت اور کبھی معالجات جیسے مضامین پڑھائے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ طبی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں تکمیل الطب کالج کے پرنسپل حکیم عبد الحسیب کے اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ چلے جانے پر پرنسپل کے عہدۂ جلیلہ پر کام شروع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں اپنی ہی مادرِ علمی سے بحیثیتِ پرنسپل سبکدوش ہو گئے۔

دورانِ ملازمت آپ کو طبیہ کالج کشمیر نیز دہلی طبیہ کالج میں پرنسپل کے عہدہ کی پیش کش ہوئی۔ لیکن آپ نے اپنے مادرِ علمی تکمیل الطب کالج کو چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ تکمیل الطب کالج سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مینیجنگ باڈی نے آپ کو کالج کے سکریٹری جیسے اہم عہدہ پر مقرر کر دیا۔ انھوں نے اپنے مختلف ادوار میں ادارہ کی تاریخی روایات کا پورا لحاظ رکھا۔ حکیم شکیل احمد شمسی کے دور میں تکمیل الطب طبیہ کالج نے نمایاں ترقی کی۔

آپ تکمیل الطب کالج اور خاندانِ عزیزی کی طبی تحریک کے پیروکار کی حیثیت سے نہ صرف یوپی بلکہ پورے ہندوستان میں پہچانے جانے لگے۔ طبی تحریکات سے شکیل احمد شمسی کو ابتدا سے ہی تعلق رہا۔ انجمن طبیہ یوپی اور اس کے بعد آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ برسوں یونانی طبی کانفرنس

صوبۂ یوپی کے صدر رہے اور آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے سینیئر نائب صدر کی حیثیت سے مختلف اہم اور نازک مرحلوں پر انھوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ طبی کانفرنس کے عام جلسوں اور اس کی مجلسِ عاملہ کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے قیام کے بعد وہ اس کی پہلی کونسل کے ممبر منفرد ہوئے۔ سنٹرل کونسل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی متعدد سب کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

ہندوستان کے بیشتر طبیہ کالجوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ تھے اور حکومت ان کے وسیع تعلیمی تجربات سے استفادہ اٹھاتی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم نے ان کو جب طبیہ کالج علی گڑھ کو بلانا چاہا اور اسی طرح ۱۹۵۵ء میں کرنل بشیر حسین زیدی نے طبیہ کالج بورڈ دہلی کے جب وہ چیئرمین تھے ان کو پرنسپل کی حیثیت سے بلانا چاہا تو حکیم شکیل احمد شمسی نے لکھنؤ اور مادرِ علمی صرف اس لئے نہیں چھوڑنا پسند کیا کیونکہ وہاں لکھنؤ کی علمی و ادبی محافل کا فقدان تھا۔

تصانیف :-

ان کے زیرِ ادارت کئی برس تک تکمیل الطب کالج کا میگزین بطور ماہانہ شائع ہوتا رہا۔ ان میگزینوں کے کئی دقیق نمبر شائع ہوئے تھے اور دو خصوصی پیش کش حمیات حصہ اوّل و دوم نیز بحران پر بھی نمبر نکالے۔

طبی تصانیف میں حمیات بحران کے ساتھ ایک مختصر رسالہ کتابی شکل میں طبی کیمیا کے نام سے تحریر کیا تھا ان کی سب سے نمایاں کتاب کتابُ الولادت ہے جو آج بھی طبیہ کالجوں کے درسیات میں مفید خیال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر اڈیشن میں طبِ جدید کے ساتھ طب قدیم سے بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا کتب کا طبی دنیا میں بلند معیار ہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی صاحب کی شخصیت بحیثیت ایک طبیب کے زیادہ مستحکم ہے۔ لیکن آپ ادب میں بھی ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ آپ نے حج جیسا مقدس و بابرکت

ذیقعدہ ۱۹۶۹ء میں ادا کیا۔ واپسی کے بعد آپ نے اپنا سفرنامۂ حج جس کو متعدد اہلِ قلم پہلے ہی سپردِ قلم کر چکے تھے لیکن حکیم شمسی کے سفرنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اردو تاریخ میں یہ پہلا سفرنامۂ حج ہے جو ہوائی جہاز سے کیا گیا تھا اور اس کے تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔

حکیم شکیل احمد شمسی کا یہ سفرنامہ "ارضِ حرم تک" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں چھپا تھا۔
حکیم صاحب شمسی نے کتنے اچھے پیرایہ میں کہا ہے ؎

الجھی ہوئی یادوں کے صنم لے کے چلے ہیں — دیوانے یہ کیا سوئے حرم لے کے چلے ہیں
آشفتہ خیالات کی شوریدہ سری بھی — جذبِ نگہِ ناز یہ خم لے کے چلے ہیں
کچھ چاکِ گریباں نئے رنگِ جنوں میں — کیا جانے کہاں دیدۂ نم لے کے چلے ہیں
جلتا ہوا احساس ہے بہکا ہوا دل ہے — الجھے ہوئے حالات کے غم لے کے چلے ہیں
کہسار و فلک جس کے سزاوار نہ ٹھہرے — وہ بارِ گراں دیکھئے ہم لے کے چلے ہیں
ناگفتہ خلش بھی ہے مسرت کے جلو میں — اب کشمکشِ آئینۂ غم لے کے چلے ہیں
آنکھوں سے چھلکتے ہوئے تقدیر کے شکوے — ہم تیرے تغافل کی قسم لے کے چلے ہیں
اک انجمنِ ناز سے آیا ہے بلاوا — پھر ذوقِ نظارا کے قدم لے کے چلے ہیں

ہم گامزنِ منزلِ جاناں ہیں جو شمسی
سامانِ خرد ساتھ میں کم لے کے چلے ہیں

مندرجہ بالا اشعار آپ نے حج کے موقع کے لئے کہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ متعدد عمرے بھی ادا کئے تھے۔

شعر و شاعری:۔

حکیم شکیل احمد کا تخلص شمسی تھا۔ ان کی آخری تصنیف ان کا شعری مجموعۂ کلام جو قیدِ حیات و بندِ غم کے نام سے ۱۹۸۵ء میں زیورِ طباعت سے مزین ہوا سفرنامۂ حج "ارضِ حرم تک" اور شعری مجموعۂ کلام "قیدِ حیات و بندِ غم" ہندوستان کے مشہور اردو کتب کے ناشر نسیم بکڈپو کے مالک نسیم انہونوی نے جو سینکڑوں اصلاحی۔ سماجی۔ معاشرتی نیز ادبی ناولوں کے نہ صرف مصنف ہیں بلکہ ناشر بھی ہیں طبع

کرائی ہیں۔
حکیم شکیل احمد شمسی نے غزلوں کے اس مجموعہ کا انتساب اپنی دیرینہ مطب کی ساتھی مس نسیم کے نام کیا ہے جو نہ صرف حکیم شمسی کی رفیق رہیں بلکہ آخر عمر تک شریک مطب رہیں۔
حکیم شمسی نے اپنے اس مجموعہ کے انتساب کو مندرجہ ذیل اشعار سے مزین کیا ہے۔

شعروں کو حسن دے کے غزل کو سنوار کے
فکر و نظر میں رنگ محبت نکھار کے
خود چل دیئے تو مر گئے نغمے بہار کے
ہم رہ گئے متاعِ سخن تک بھی ہار کے

حکیم شمسی کا فطری رجحان اگر فنون لطیفہ شعر و ادب۔ فلسفہ اور مادرانیات میں تھا تو علاج و معالجہ۔ مطالعہ۔ طبی و ادبی نوشت و خواند محفل آرائی اور خلوت گزینی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگر ایک جانب مفکر تھے تو دوسری جانب عظیم شاعر بھی تھے۔ حکیم شکیل احمد شمسی اپنی عملی مصروفیات کے باعث ہی نہیں بلکہ طبعًا بھی وہ تمام شعرا کی طرح عوامی مشاعروں میں بھی شرکت کرنا پسند نہ فرماتے۔ صرف چیدہ چیدہ محافل شعر و سخن ہی میں اپنے افکار کو اشعار و غزلوں کی شکل میں پیش کرتے اور وافر داد پاتے۔ مشاہیر شعرا، حکیم شمسی صاحب کے کلام کو سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ خود حکیم صاحب کے گھر پر برابر شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ مندرجہ ذیل کلام جوان کے جذبات و خیالات کے آئینہ ہیں۔ اندازہ ہوگا کہ حکیم شمسی کتنے پائے کے شاعر تھے۔

(۱)

نہ بزم شوق میں ہلچل نہ ولولوں پہ شباب
پڑی ہے موت کے چہرے پہ زندگی کی نقاب
کہاں سے کیجئے ایام زندگی کا حساب
پلٹ گیا ہے ورق بند ہو گئی ہے کتاب

سراب صبح بنارس فریب شام اودھ
وہ آفتاب کا دھوکا یہ فتنۂ مہتاب

---

(۲) تمھاری چشم تغافل کی بے رُخی کی قسم
جہاں پہ چھوڑ گئے تھے ابھی وہیں ہیں ہم
ہمارے شہر نگاراں کا ہے یہ کیا عالم
بجھی بجھی ہے محبت تھکے تھکے ہیں قدم

---

(۳) چاہتا ہوں کہ پھر افسانۂ دل دہراؤں
ہو اجازت تو سر عام تجھے لے آؤں
ابھی راہوں میں حرم بھی ہیں صنم خانے بھی
ان مقاموں سے گذر جاؤں تو منزل پاؤں

جذبات کا اظہار اگر حرکات میں ہو تو رقص۔ رنگ و خطوط میں ہو تو مصوری۔ آواز و آہنگ میں ہو تو موسیقی اور الفاظ میں ہو تو شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی نے جذبوں کا اظہار اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی الفاظ یعنی شعر و شاعری میں کی ہے۔

انسان کے ذاتی خیالات و احساسات و جذبات کو جب کوئی ٹھیس لگتی ہے یا جب وہ عمل رد عمل شکست۔ مزاحمت۔ سپر اندازی اور ٹکراؤ کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے تب یہی عناصر مل کر شعر و نغمہ کا روپ لے لیتے ہیں۔ اشعار گنگنا کر وہ اپنے اندر موجود خلش کی تسکین کرتا ہے۔ دل کی آگ کو ٹھنڈا بھی کرتا ہے تو کوئی بھڑکاتا بھی ہے۔ کبھی ہر چوٹ پر تلملا کر لاف زنی کرتا ہے تو کبھی ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جاتا ہے تو کبھی کرب و الم کی لذت کوشی کرتا ہے۔ اس کی غرض تو آسودگی سے ہے۔ حکیم شمسی نے بھی اپنے جذبات کی تسکین شعر و شاعری میں کی ہے۔

ان کی شاعری میں غم ماضی۔ غم دوراں۔ غم عشق کی جو جھلک بشکل آپ بیتی ہے وہ

جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ع

(۴) جنونِ عشق میں بے چارگی ایسی بھی ہوتی ہے
کہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں مگر ہر چیز روتی ہے
تماشا ہیں ہمارے دل کے ہنگاموں کی راتیں بھی
محبت جاگتی رہتی ہے اور تقدیر سوتی ہے

---

(۵) عشق کے غم نہ چھپے لاکھ چھپانا چاہا
لب کو رد کا تو نگاہوں نے بتانا چاہا
دل سے کچھ بن نہ پڑا اُن کو بھلانا چاہا
اُن کی یادوں نے مگر خود ہی نہ جانا چاہا

پھر ایک غزل میں کہتے ہیں۔

بجھا دوں کس طرح تیرے تصور کے چراغوں کو
خدا جانے کہاں کب زندگی کی شام ہو جائے

شعر و شاعری کے ذوق کے علاوہ حکیم صاحب اُردو کے بہترین ادیب، خطیب مصنف اور صحافی بھی رہے اور ایک مدت تک رسالہ تکمیل الطب کے مدیر رہے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کو سیاست سے گہری دلچسپی تھی تاہم خود کبھی کسی قسم کی سیاست میں نہیں اُلجھے اور نہ کبھی کسی سیاسی پارٹی کے نظریات کو قبول کیا۔ طبی سیاست پر گہری نظر ضرور رہی لیکن گھٹیا قسم کی سیاسی حرکتوں سے اپنے کو آزاد اور پاک رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ طبی دنیا کے ہر طبقہ فکر و عمل کے لوگوں میں وہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے رہے اور ان کے غیر جانبدارانہ مشورہ اور خیالات کی قدر سب ہی لوگ کرتے۔ طبی تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی کی پیش کش کو تو بخوبی قبول فرماتے لیکن کسی منصب کے لئے الیکشن نہیں لڑے۔ اپنی شخصیت کو متنازعہ نہیں بننے دیا۔ مختلف اداروں کے لکھنؤ میں صدر، سکریٹری یا نائب صدر بھی رہے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کو مطالعہ کا شوق حد درجہ تھا۔ کم سے کم دو گھنٹہ اس عدیم الفرصتی میں بھی مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ اخبار کا مطالعہ ان کی عادت میں شامل تھا۔ اس ذوق

کی تسکین کے لئے اپنا کتب خانہ بھی تھا جس میں مختلف موضوعات کی کتب بشمول طب۔ مذہب تاریخِ ادب۔ مختلف زبانوں کی لغات رسائل پر مشتمل تھا۔ ان کتب کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

غرض حکیم شمسی عظیم شاعر و مفکر اور ادیب ہی نہیں بلکہ عالمِ دین بھی تھے۔ مذہبی معاملات میں بڑی عالمانہ بحث و تقریر فرماتے تھے۔ ان کے ایسے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے جن میں مذہبی مسائل پر علمی بحث ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں مولانا منظور نعمانی مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے اکثر نسبت ہوا کرتی تھی۔

پسماندگان :-

حکیم شکیل احمد شمسی کے ۳ صاحبزادے مظفر اقبال شمسی جو وکیل ہیں۔ عقیل احمد شمسی جو سعودی عرب میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں اور طارق شکیل شمسی کے علاوہ ۳ دختران عذرا۔ طلعت اور صبیحہ ہیں۔ ایک ڈاکٹر اکمل شمسی کو منسوب ہیں دوسری محکمۂ عدلیہ کے جج فضل الباری کو بیاہی ہیں۔

حکیم شکیل کا مطب قلبِ شہر یں شفا محل عبدالعزیز روڈ پر واقع تھا۔

وفات :-

۱۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو بوقت ۳ بجے سہ پہر لکھنؤ کے کارڈیالوجی سینٹر میں داغِ مفارقت دے گئے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کے انتقال پُر ملال پر متعدد شعراء نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا لیکن حکیم ظل الرحمن آرگنائزنگ سکریٹری آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس نے حکیم شمسی کے لئے جن جذبات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے وہ نہ صرف ان کے بلکہ تمام اطباء کے جذبات کی ترجمانی ہے۔

آہ حکیم شکیل احمد شمسی

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی

کوئی رہبر کوئی نقش پا بھی نہیں
جانے کیا ان کی ویرانیوں نے کہا
زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
راہ ویراں ہے کس کو آواز دوں
فکر و فن کی شمعوں سے روشن رہے
ایک غم ایک خلش ایک چبھن دے گئی
گاتے گاتے غزل کوئی چپ ہو گیا
بزم کی خامشی داستاں بن گئی
آج پھر ایک خبر موت کی ساقیا
کتنی آنکھوں میں ویرانیاں چھا گئیں
آ[illegible] اک خبر موت کی ساقیا

کوئی شمع سر رہ گذر بھی نہیں
میرے ذوق طلب میں کمی آگئی
وہ نقوش قدم ہیں نہ زلفوں کے خم
کوئی ایسا نہیں جو مری انجمن
آج پھر ایک خبر موت کی ساقیا
مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی
پیتے پیتے کوئی بادہ کش سو گیا
زندگی موت کی میزباں بن گئی
کتنے چہروں کی صبحوں کو گہنا گئی
کتنی کلیاں اُمیدوں کی کمھلا گئیں
ایک غم ایک خلش ایک چبھن دے گئی

مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی
آج کم خواب آنکھوں کو نیند آگئی
زندگی گوشۂ عافیت پا گئی